نئی لائبریری

گرہن

افسانے

راجندر سنگھ بیدی

نیا ادارہ

گرهن

"گرہن" کے افسانوں میں راجندر سنگھ بیدی کی فنی مہارت اور باطنی بصیرت نے مل کر اردو افسانے کی محدود عمل داری میں کتنے ہی نئے، اچھوتے اور گہرے انسانی مسایل کو ایک فن کار کی تمام تر ریاضت و ہنر مندی کے ساتھ اس طرح بسایا ہے کہ اردو افسانے کا دامن ان شہ پاروں کی تابانی سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ بلاشبہ یہ افسانے اردو کے کلاسیکی ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ انسانی زندگی کے درونِ خانہ گوشوں تک جھانکنے میں ان سے بہت مدد ملتی رہے گی۔

بیدی غالباً اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جس کی آنکھ روشن اور دل گرم ہے۔

"ہــولی" کے نام

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

نیا ادارہ
لاھور
پاکستان

طابع و ناشر: مشتاق احمد چودھری
نیا ادارہ ، سویرا آرٹ پریس ، لاہور

افسانے

پیش لفظ

جیسے ہم کہتے ہیں کہ کسی قوم کی صحت مندی اور طاقت کا اندازہ اس دور کے ادب کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ویسے ہی اس بات کا الٹ بھی درست ہے یعنی ادب کی اچھائی یا برائی کا اندازہ کسی قوم کی صحت و تندرستی پر مبنی ہے۔ ہمارا ملک ایک خاص قسم کی جسمانی و ذہنی غلامی اور جمود کی حالت میں سے گزر رہا ہے اور وہ تمام طبعی طاقتیں جو اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے ممد معاون ثابت ہوتی ہیں، ابھی جمع نہیں ہوئیں۔ ہمارے ادیب ملازمتوں اور دیگر معین و غیر معین نامساعد حالات میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ دن میں دفتروں میں نو دس گھنٹے کام کرنے کے بعد تخلیقی ادب نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے حالات میں جب کہ ان کے دماغ کو استراحت نہیں۔ ان کے اعضا تھکاوٹ سے چور ہیں اور جسم کے تمام قوا مضمحل تو ہمارا ان کے متعلق اپنی توقعات کو بلند کر لینا عبث ہے۔

ایک نیا اور اہم دور کٹھالی میں ہے۔ آندھی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی اُمس ہوتی ہے اس کا ظہور ہمارے ادب میں بھی ہے۔ اس میں کوئی بھی جنبش، کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ ایک خاص قسم کے تخریبی و انتقامی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے ہمیں قطعاً مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ترقی پسندی کے سہارے محض عام نام کے تحت جو جنسی کوڑا کرکٹ اچھالا جا رہا ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی صورت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے ایک ایسے ہی انتقالی دور کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن ع

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔

ہمیں ناامیدی اور یاسیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔

"دانہ و دام" کے بعد میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ پیش کرتا ہوں۔ افسانوں کے اس مجموعے میں وہ تمام فطری کمزوریاں ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں لیکن میں مایوس نہیں اور یقیناً بہت آگے قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فارم کی نسبت میرے لئے نفسِ مضمون کا مسئلہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور جہاں تک مضمون کا تعلق ہے وہی ادبی تخلیق زیادہ کامیاب ہوگی جو اپنے عہد کے گرد گھومے، اپنے ماحول کے نزدیک تر ہے۔ مثلاً ہم اپنے مزدور کی زبان کا یوپی کے مزدور کی زبان میں ترجمہ کریں تو ہماری تخلیق ایک ناقابلِ معافی تصنع کی حامل ہوگی۔ میرا ماحول اگر پنجابی ہے اور میں پنجابی اردو لکھتا ہوں تو کوئی قصور نہیں کرتا بلکہ اپنے خلوص کا ثبوت دیتا ہوں۔

اب میں اپنی فارم کے متعلق ایک آدھ بات کہہ دوں۔ مجھے تخیلی فن میں یقین ہے۔ جب کوئی واقع مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہارِ حقیقت کے لئے ایک رومانی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا بجائے خود کسی حد تک رومانی طرزِ عمل ہے اور اس اعتبار سے مطلق حقیقت نگاری بحیثیتِ فن غیر موزوں ہے۔ اس مجموعے کے پہلے افسانے کی متوازیات (PARALLELISMS) میرے مطلب کی وضاحت کرتی ہیں۔ لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفسِ مضمون کا محض ظاہری (PHYSICAL) پہلو پیدا ہوا۔ یہاں تک تو مشاہدے کا تعلق تھا لیکن اس کے بعد میرے تخیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو تلاش کر لیا۔ ذہن و تحریر میں دونوں آپس میں یوں گھل مل گئے کہ مجموعی طور پر ایک تاثر کی صورت اختیار کر لی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

رشی نگر لاہور

۱۰ مارچ ۱۹۴۲

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

رُوپا، شِبو، کَتھو اور مُنّا ——— ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے، گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل میا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد تھا گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا اپھاڑ سکے ——— پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے، وہ سی نہ سکتی تھی ——— منہ سِلا بچہ پیدا ہوگا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ——— اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبے سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا ارمان تھا۔ لیکن اب وہ سسرال سے اتنی بیزار ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر پھول بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بت سے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی چوکا برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیئے ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گریادہ بدزیب، فراخ نتھنوں والی ہٹیلی میا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقع تھی۔ چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی —— دوپہر تک ڈھولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی۔ پھر جانوروں کے لئے بنولے، کھلی اور چنے بھگونے چلی جاتی کہ اس کے کولہے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پہ بیٹھ گئی لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پہ بیٹھنے کے قابل نہ تھی۔ اور پھر میا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا ہو تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی میا اور کائستھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی تو ایک شکم پر کتیا کی طرح [illegible] سے پھیلا کر جماہی لیتی اور چٹائی پر [illegible] کا بچہ جیسے

ہاتھ سے اپنے پیٹ سے دور زرخیز کو سہلانے لگی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ ستیل کی بیٹی ہے وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ ستیل سارنگ پور گرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ پور گرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے ان کائستھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ کائستھوں کو تو بچے چاہئیں۔ ہمیں جہنم میں جائے۔ لڑکیاں ان سے گجرات میں یہ کائستھ ہی کل ودھو (کل کو بڑھانے والی — بہو) کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ پلتا ہے اور اسی لئے اسے حمل کے ترو شنا اور اب پھل آزاد نہ دیے جاتے تھے —

”دیو رہے تو وہ ایک بیٹے لیتا ہے“ ہولی سوچتی تھی۔ ”اور ماں کے سینہ پر بیٹھے سے کہیں بڑے ہیں، اور بڑے کائستھ جب ڈانٹتے ہیں تو بابا کے منہ سے دین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ ...... رسیا کی بات تو دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا! ...... لیکن کیا شاستر بھی عورت نے بنائے ہیں؟ اور دنیا کی تو بات ہی علیحدہ ہے — شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے، تو وہ اپنی ہم جنس پر اتنی [illegible] بار بار اپنی زبان [illegible] کرتی ......“

...... [illegible]

اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیئے مگر جیتے رہے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں اس کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلے لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی، بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں...... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا کالا راکشس، شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر آتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ منّا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آ موجود ہوا — کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے میّا آئی اور آتے ہی بولی:

”بہو...... اناج رکھا ہے کیا؟“

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی ”ہاں ہاں...... رکھا ہے — نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی میّا......“

”تو بیٹھی کر کیا رہی ہے، اب جا دی؟“

ہولی نے رحم چاہنے والی نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی ”جی، مجھ سے اناج کی بوری ہلائی نہیں جاتی۔ پیٹ نہیں؟“

میّا لاجواب ہو گئی۔ اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پرواہ تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔۔۔

"تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟۔۔۔۔ رانڈ، جانتی بھی ہے آج گہن ہے جو بچہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بیسوا اُسے پالنے چلے گی؟"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ وہ سب ہو جاتے لیکن رانڈ کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میّا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سُرمہ پیسنے کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پُرہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا:

"میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کاہے کی تھی؟"

"جلدی کیسی؟"

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہی۔۔۔۔۔ تم بھی تو کتیا ہو، کتیا؟"

ہولی سہم کر بولی۔ "تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی۔ رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے

اس وقت ہولی ماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بہو سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا۔ البتہ میاں کی اس عادت سے جل بھن گئی۔ "رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی زیادہ، اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے......"

ہولی سوچتی تھی کل رسیلے نے مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور آج اس لئے مارا کہ میں نے بات کا جواب دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے۔ کیوں گالیاں دیتا ہے۔ میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ نہیں دکھائی دیتا ...... اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد......!

ماں نے کچھ ماش، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں انہیں تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا یہ ماں بھی دیکھ رہی تھی اور جب ماش یعنی چاول پیندے سے چمٹ گئے تو بہو مرلی کرتی پھوہڑ رہ گئی اور آپ اتنی سگھڑ بن کے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر پر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی:

"لے، دھو ڈال"

اب ہولی نہیں جانتی بیچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بچے یا نہ بچے، پکڑیا نہ مٹے، جو کچھ ہے پیٹ کا بچہ بچا دی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گہن کے زمرہ میں داخل ہوتے دانا ہی ہوگا۔ بچہ دھیان سے ہوتے

کپڑے کی طرح چڑمڑ سا پیدا ہوگا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا بُرا سا چہرہ دکھیں لیے کہا جاتے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے ؟...... لیکن قصور اور بے قصوری کی تو بات ہی علیحدہ ہے کیونکہ یہ کوئی سننے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے ۔ سب گناہ ہولی کا ہے ۔

اس وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آگیا کس طرح وہ اسو جکے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی ۔ اور بجائی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی اس وقت سب عورتیں اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں ——

ماہندی[1] تو ادی مالوے   اینو رنگ گیو گجرات رے
ماہندی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی ، ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم ، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا ۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی ۔ شباب بھادوں تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں —— وہ بھی لینے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی ۔

...... سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے ۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تروینی گھاٹ پر اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں ۔ پھول ، ناریل ، بتاشے

[1] ماہندی (حنا) تو مالوہ —— وسط ہند میں پیدا ہوئی ۔ اس میں گجرات [illegible]
ہے ۔ (گویا) اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے ۔

گرہن

سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منہ کھولے ہوتے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور ——— ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے ...... ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گہنا جاتے ہیں۔ پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک وصاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے، پھر گھنٹے، ناقوس، شنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور وغوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں گٹھڑی کی صورت میں گاتے بجاتے ہوئے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے، پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرمل منہ دان دینا ہے تاکہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے ——— چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

گرہن

چاند گرہن کے زمرہ میں آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے راستے کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر بھول بندر کی طرف انسان کے ستے چلی۔

اب منا، رسیلا، بڑا اڑوکا شبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے۔ گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ شنک کا نور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پہ بہا دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی ——— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے گھاٹ سے پون میل کے قریب ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر بھول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چبوترے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹنڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کش مکش کے حالات ننھے ننھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب دار پانی کی لہروں پہ ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک ٹنڈل سے سامنے ایک اژدہا نما رسے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی۔ پھر وہ سارنگ دلیہ گرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پہ سوار ہو جائے تو کچھ ڈیڑھ دو گھنٹے ہی وہ چاندنی میں نہاتے ہوگے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں ...... اور کچھ ہی اماں ...
کنوار پن اور گربا ناچ!

ہولی نے ایک نگاہ سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ جس کی ماں نے اتنی

بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آپڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑلی۔ اب گھاٹ آچکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے۔ . . . . اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پراسرار بعیدالفہم طاقت ہے —— اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا —— دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی . . . . آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں —— سارنگ دیو گرام کے سامنے . . . . . وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹینڈل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں . . . . پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا —— مرغی . . . . . دو سنے . . . . . چابیاں میرے پاس ہیں . . . . . . پانی زیادہ ہوگا . . . .

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی

ملاپ میں وارد ہوا تھا جبکہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیوگرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور میکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوتے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سابرمتی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا۔ اور کچھ دلیری سے بولی:

"کتھو رام"

کتھو رام نے بھی ستیل کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا۔

کتھو رام بولا ——

"ہولے"

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کتھو بھیا ... مجھے سارنگ دیوگرام پہنچا دو ......"

کتھو رام قریب آیا۔ ایک ٹینڈل کو گھورتے ہوئے بولا:

"سارنگ دیو جاؤ گی ہولے؟" اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟"

ٹینڈل جو سب سے قریب تھا بولا:

"بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

کتھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا:

"ہولے ...... کیا تم اساڑھی سے بھاگ آئی ہو؟"

"ہاں"

"یہ سریپچ جادیوں کا کام ہے؟ .... اور جو میں کاستھوں کو خبر کر دوں تو؟"

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو نباب جادی تھی اور نہ سریپچ جادی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کتھورام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کے رستے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیوگرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کتھورام بولا "ڈرو نہیں ہولے ..... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور نا تو پڑتی ہے۔ پو پھٹے سے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔"

کتھورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کتھورام اور اس کے ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کتھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟"

کتھورام نے آہستہ سے جواب دیا "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کتھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کتھورام اندر آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی......

سمندر کی ایک بڑی بھاری چھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہا کرلے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے عیب ترین گناہ بھی لیتی گئی —— دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر کی طرف........ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی........ پھر شنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ، گرتی...... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی۔ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی...... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا جا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے بھی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا....... دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے........ چاروں طرف گھپ اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اسارے سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں ——

دان کا وقت ہے......

چھوڑ دو ...... چھوڑ دو...... چھوڑ دو......

ہر طرف بند سے آواز آئی ——

گرہن

پکڑلو......پکڑلو...پکڑلو.....

....

....

چھوڑدو.......دان کا وقت ہے......پکڑلو.....

چھوڑدو!!

رحمان کے جُوتے

دن بھر کام کرنے کے بعد جب بڑھا رحمان گھر پہنچا تو بھوک اسے بہت ستا رہی تھی۔ جینا کی ماں، جینا کی ماں، اس نے چلاتے ہوئے کہا —— کھانا نکال دے بس جھٹ سے۔ بڑھیا اس وقت اپنے ہاتھ کپڑوں لتوں میں گیلے کیے بیٹھی تھی اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنے ہاتھ پونچھ لے، رحمان نے ایک دم اپنے جوتے کھاٹ کے نیچے اتار دیے اور کھدر کے ملتانی تہمد کو زانوؤں میں دبا، کھاٹ پر چوکڑی جماتے ہوئے بولا —— بسم اللہ!

بڑھاپے میں بھوک جوان ہو جاتی ہے۔ رحمان کی بسم اللہ بڑھاپے اور جوانی کی اس دوڑ میں رکابی سے بہت پہلے اور بہت دور نکل گئی تھی اور ابھی تک بڑھیا نے سجی اور نیل میں بھگوئے ہوئے ہاتھ دوپٹے سے نہیں پونچھے تھے۔ جینا کی ماں برابر چالیس سال

سے اپنے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی آئی تھی اور رحمان قریب قریب اتنے ہی عرصے سے خفا ہوتا آیا تھا لیکن آج یک لخت وہ خود بھی اس وقت بجانے والی عادت کو سراہنے لگا تھا۔ رحمان بولا جینا کی ماں، جلدی ذرا . . . . . اور بڑھیا اپنی چوالیس سالہ، دقیانوسی ادا سے بولی۔ آتے ہے، ذرا دم تو لے با با تو!

سوء اتفاق رحمان کی نگاہ اپنے جوتوں پر جا ٹھی جو اس نے جلدی سے کھاٹ کے نیچے اتار دیئے تھے۔ رحمان کا ایک جوتا دوسرے جوتے پر چڑھ گیا تھا۔ یہ مستقبل قریب میں کسی سفر پہ جانے کی علامت تھی۔ رحمان نے ہنستے ہوئے کہا:

آج پھر میرا جوتا جوتے پر چڑھ رہا ہے، جینا کی ماں ——— اللہ جانے میں نے کون سے سفر پہ جانا ہے!"

جینا کو لئے جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟ ——— بڑھیا بولی، یونہی تو نہیں تیرے گوڈے دھو رہی ہوں، بڈھے! دو پیسے ڈیل کا تو نیل ہی لگ گیا ہے تمہارے کپڑن کو۔ کیا تو دو پیسے روز کی کمائی بھی کرتے ہے؟

ہاں ہاں! بڈھے رحمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کل میں نے اپنی اکلوتی بچی کو لینے انبالے جانا ہے۔ تبھی تو یہ جوتا جوتے سے نیارا نہیں ہوتا۔ پار سال بھی جب یہ جوتا جوتے پر چڑھ گیا تھا تو رحمان کو پرچی ڈالنے کے لئے ضلع کچہری جانا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اس سال کا سفر اور جوتوں کی کرتوت اچھی طرح سے محفوظ تھی۔ ضلع کچہری سے واپسی پر اسے پیدل ہی آنا پڑا تھا۔ کیونکہ ہونے والے ممبر نے تو واپسی پہ اس کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ اس میں ممبر کا قصور نہ تھا۔ بلکہ جب رحمان پرچی پر نیلی چوخی کا نشان ڈالنے لگا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس نے گھبرا کر پرچی کسی دوسرے ممبر کے حق میں دی تھی۔

گرہن

جبینا کو ملے دو سال ہونے کو آتے تھے۔ جبینا انبالے میں بیاہی ہوئی تھی۔ ان دو سالوں میں آخری چند ماہ رحمان نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دہکتا ہوا اُپلا اس کے دل پر رکھا ہوا ہے۔ جب اسے جبینا کو ملنے کا خیال آتا تو اسے کچھ سکون، کچھ اطمینان میسر ہوتا۔ جب ملنے کا خیال ہی اس قدر تسکین دہ تھا تو ملنا کیسا ہوگا؟ ——— بڈھا رحمان بڑی حیرت سے سوچتا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو ملے گا اور پھر تلنگوں کے سردار علی محمد کو۔ پہلے تو وہ رو دے گا۔ پھر ہنس دے گا، پھر رو دے گا اور اپنے ننھے نواسے کو لے کر گلیوں، بازاروں میں کھلاتا پھرے گا . . . . . یہ تو میں بھول ہی گیا تھا، جبینا کی ماں! رحمان نے گھاٹ کی ایک کھلی ہوئی رسی کو عادتاً گھسا کر کاٹتے ہوئے کہا ——— بڑھاپے میں یادداشت کتنی کمزور ہو جاتی ہے۔

علی محمد جبینا کا خاوند، ایک وجیہہ جوان تھا۔ سپاہی سے ترقی کرتے کرتے وہ نائیک بن گیا تھا۔ تلنگے اسے اپنا سردار کہتے تھے۔ صلح کے دنوں میں علی محمد بڑے جوش و خروش سے ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ این۔ ڈبلیو۔ آر؛ پولیس مین، برگیڈ والے، یونیورسٹی والے اس نے سب ہرا دیئے تھے۔ اب تو وہ اپنی المٹی کے ساتھ بصرے جانے والا تھا۔ کیونکہ عراق میں رشید علی بہت طاقت پکڑ چکا تھا . . . . . . اس ہاکی کی بدولت ہی علی محمد کمپنی کمانڈر کی نگاہوں میں اونچا اٹھ گیا تھا۔ نائیک بننے سے پہلے وہ جبینا سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا لیکن اس کے بعد وہ اپنی ہی نظروں میں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جبینا اسے پاؤں تلے نظر نہ آتی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی مسز ہولٹ، کمپنی کمانڈر کی بیوی نے تقسیم انعامات کے وقت انگریزی میں علی محمد سے کچھ کہا تھا۔ جس کا ترجمہ صوبیدار نے کیا تھا ——— میں چاہتی ہوں تمہاری اسٹک چوم لوں۔ علی محمد کا خیال تھا کہ

لفظ اشک نہیں ہوگا، کچھ اور ہوگا۔ بڑا حاسد ہے صوبیدار، انگریزی بھی تو بس گوہانے تک ہی جانتا ہے۔

رحمان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے اپنے داماد سے نہیں بلکہ کسی بہت بڑے افسر سے ملنے جانا ہے۔ اس نے کھاٹ پر سے جھک کر جوتے پر سے جوتا اتار دیا گویا وہ انبالے جانے سے گھبراتا ہو۔ اس عرصے میں جینا کی ماں کھانا لے آئی۔ آج اس نے خلاف معمول گائے کا گوشت پکا رکھا تھا۔ جینا کی ماں نے گوشت بڑی مشکل سے قصبے سے منگوایا تھا۔ اور اس پر گھی اچھی طرح سے چھوڑا تھا۔ چھ ماہ پہلے رحمان کو دمّے کی سخت شکایت تھی۔ اس لئے وہ تمام مولدات، سودا، گڑ، تیل، بینگن، مسور کی دال، گائے کے گوشت اور چکنی غذا سے پرہیز کرتا تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں رحمان نے شاید سیر کے قریب نوشادر چھاچھ کے ساتھ گھول کر پی لیا تھا تب کہیں اس کے سانس کی تکلیف دور ہوئی تھی۔ بھوک لگنے کے علاوہ اس کے پیشاب کی سیاہی سپیدی میں بدلی تھی۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی ویسے ہی نمایاں تھی۔ پلکوں پر کی بھربھراہٹ بھی قائم تھی۔ اور جلد کا رنگ سیاہی مائل نیلگوں ہو گیا تھا۔ گائے کا گوشت دیکھ کر رحمان خفا ہو گیا۔ بولا ــــــ چار پانچ روز ہوئے تو نے بینگن پکائے تھے۔ جب میں چپ رہا۔ پرسوں مسور کی دال پکائی جب بھی چپ رہا۔ تو تو بس چاہتی ہے کہ میں بولوں ہی نہیں۔ مری مٹی کا ہو رہوں۔ سچ کہتا ہوں تو مجھے مارنے پہ تلی ہے۔ جینا کی ماں!

بڑھیا پہلے روز سے ہی، جب اس نے بینگن پکائے تھے، رحمان کی طرف سے اس احتجاج کی متوقع تھی۔ لیکن رحمان کی خاموشی سے بڑھیا نے الٹا ہی مطلب لے لیا۔ دراصل بڑھیا نے قریب قریب ایک نکھٹو آدمی کے سے اپنا ذائقہ بھی ترک کر ڈالا تھا۔ بڑھیا کا سوچنے

گرہن

کا ڈھب بھی نیارا تھا۔ جب سے وہ پیٹ بڑھے ہوئے اس ڈھانچ کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی۔ اس نے سُکھ ہی کیا پایا تھا۔ بھلا چنگا رحمان لدھیانے میں سپاہی تھا لیکن ایک تربوز پر سے پھسل کر گھٹنا توڑ بیٹھنے سے اس نے پنشن پالی تھی اور گھر میں بیٹھ رہا تھا۔ بڑھیا نے کپڑے پھانٹتے ہوئے کہا ——— تو نہ کھا ہا! —— تیری کھاطر میں تو نا مروں، مجھے تو روج دال، روج دال میں کچھ مجا نہیں دِکھے۔

رحمان کا جی چاہتا تھا کہ وہ کھاٹ کے نیچے سے جوتا اٹھا لے اور اس بڑھیا کی چندیا پر سے رہے سہے بالوں کا بھی صفایا کر دے۔ بسر کی اشم کے اترتے ہی بڑھیا کا دائمی نزلہ بھی دور ہو جائے گا۔ لیکن چند ہی لقمے منہ میں ڈالنے کے فوراً بعد ہی اسے خیال آیا۔ تلی ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ کتنا ذائقے دار گوشت پکایا ہے میری جینا کی ماں نے۔ میں تو ناشکرا ہوں پورا پورا۔ اور رحمان چٹخارے لے لے کر ترکاری کھانے لگا۔ سالن کو تر کیا ہوا لقمہ جب اس کے منہ میں جاتا تو اسے خیال آتا۔ آخر اس نے جینا کی ماں کو کون سا سکھ دیا ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ اب تحصیل میں چپراسی ہو جاتا اور پھر اس کے پرانے دن واپس آ جاتیں۔

کھانے کے بعد رحمان نے اپنی انگلیاں پگڑی کے شملے سے پونچھیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نیم شعوری احساس سے اس نے اپنے جوتے اٹھائے اور انہیں دالان میں ایک دوسرے سے اچھی طرح علیحدہ علیحدہ کر کے ڈال دیا۔

لیکن اس سفر سے چھٹکارا نہیں تھا ہر چند کہ اپنی آٹھ مدنہ گی میں لڑائی لازمی تھی۔ صبح دالان میں جھاڑو دیتے ہوئے بڑھیا نے بے احتیاطی سے رحمان کے جوتے سرکا دیئے اور جوتے کی ایڑی دوسری ایڑی پر چڑھ گئی۔ شام کے قریب ارادے پست ہو جاتے ہیں۔

گرہن

سونے سے پہلے انبالے جانے کا خیال رحمان کے دل میں کچا پکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترائی میں نلائی کر چکنے کے بعد ہی وہ کہیں جائے گا۔ اور نیز کل کی مرغن غذا سے اس کے پیٹ میں پھر کوئی نقص واقع ہو گیا تھا۔ لیکن صبح جب اس نے پھر جوتوں کی حالت دیکھی تو اس نے سوچا اب انبالے جائے بنا چھٹکارا نہیں ہے۔ میں لاکھ انکار کروں لیکن میرا دانہ پانی / میرے جوتے بڑے پردیس ہیں۔ وہ مجھے سفر پہ جانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور صبح کے وقت ارادے بلند ہو جاتے ہیں۔ رحمان نے پھر اپنا پختہ ارادہ کیا اور اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

نیل میں دھلے ہوئے کپڑے سوکھ کر رات ہی رات میں کیسے اجلے ہو گئے تھے۔ نیلاہٹ نے اپنے آپ کو کھو کر سپیدی کو کتنا ابھار دیا تھا۔ جب کبھی بڑھیا تیل کے بغیر کپڑے دھوتی تھی تو یونہی دکھائی دیتا تھا جیسے ابھی انہیں جوہڑ کے پانی سے نکالا گیا ہو اور پانی کی مٹیالی رنگت ان میں یوں بس گئی ہو جیسے پاگل کے دماغ میں واہمہ بس جاتا ہے۔

جینا کی ماں اوکھلی میں متواتر دو تین دن سے جو کوٹ کر تندل بنا رہی تھی۔ گھر میں ڈھیر سارا گڑ پڑا تھا جسے دھوپ میں رکھ کر کیڑے نکال دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ سوکھی مکئی کے بھٹے تھے۔ گویا جینا کی ماں بہت دنوں سے اس سفر کی تیاری کر رہی تھی۔ اور جوتے کا جوتے پر چڑھنا تو محض اس کی تصدیق تھی۔ بڑھیا کا خیال تھا کہ ان تمام چیزوں میں سے رحمان کا زاد راہ بھی ہو جائے گا اور بیٹی کے لئے سوغات بھی۔

رحمان کو کوئی خیال آیا۔ بولا ——— جینا کی ماں! بھلا کیا نام رکھا ہے انہوں نے اپنے منے کا؟

بڑھیا ہنستے ہوئے بولی ——— ساہتی (اسحاق) رکھا ہے نام، اور کیا رکھنا

بے نام انہوں نے اپنے ننھے کا۔ واہ! سچ مچ کتنی کمزور ہے تیری یادداشت۔

اسحاق کا نام بھلا رحمان کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ جب وہ خود بھی ننھا تھا تو اس کے دادا کو بھی رحمان کا نام بھول گیا تھا۔ دادا لکھا پڑھا آدمی تھا اس نے چاندی کی ایک تختی پر عربی لفظوں میں رحمان لکھوا کر اپنے پوتے کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ لیکن پڑھنا کسے آتا تھا۔ بس وہ تختی کو دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا۔ ان دنوں تو نام گاموں، شیرا، فتو، فجا وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ اسحٰق، شعیب وغیرہ نام تو اب قصباتی لوگوں نے رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ رحمان سوچنے لگا —— سالا اب تو ڈیڑھ برس کا ہو چکا ہوگا۔ اب اس کا سر بھی نہیں چھپتا ہوگا۔ وہ کسی دن اٹھا میری طرف ٹک ٹک دیکھتا جائے گا اور اپنے ننھے سے دل میں سوچے گا۔ اللہ جانے یہ بابا، چٹے بالوں والا بوڑھا بھلا کہاں سے آ ٹپکا۔ وہ نہیں جانے گا کہ اس کا اپنا بابا ہے، اپنا نانا جس کے گوشت پوست سے وہ خود بھی بنا ہے۔ وہ پیچھے سے اپنا منہ جینا کی گود میں چھپا لے گا۔ میرا جی چاہے گا جینا کو بھی اپنی گود میں اٹھا لوں۔ لیکن جوان بیٹیوں کو کون گود میں اٹھاتا ہے —— ناحق اتنی بڑی ہو گئی جینا۔ بچپن میں وہ جب کھیل کود کر باہر سے آتی تھی تو اسے سینے سے لگا لینے سے کتنی ٹھنڈک پڑ جاتی تھی۔ ان دنوں یہ دل پر سلگتا ہوا اُپلا رکھا نہیں محسوس ہوتا تھا .... اب وہ صرف اسے دور سے ہی دیکھ سکے گا۔ اس کا سر پیار سے چوم لے گا...... اور ..... کیا وہ تسکین حاصل ہو گی؟

رحمان کو اس بات کا تو یقین تھا کہ وہ ان سب کو دیکھ کر بے اختیار رو دے گا۔ وہ آنسو تھامنے کی لاکھ کوشش کرے گا۔ لیکن وہ آپ ہی آپ چلے آئیں گے۔ وہ اس لئے نہیں بہیں گے کہ تلنگا اس کی بیٹی کو پیٹتا ہے۔ بلکہ زبان کے طویل قصوں کی بجائے آنکھوں سے

اس بات کا اظہار کر دے گا کہ جینا، میری بیٹی! تیرے پیچھے میں نے بہت کڑے دن دیکھے ہیں۔ جب چودھری خوشحال نے مجھے مارا تھا تو اس وقت میری کمر بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ میں مر ہی تو چلا تھا۔ پھر تو کہاں دیکھتی اپنے ابا کو؟ لیکن بن آئی کوئی نہیں مرتا۔ شاید میں تمہارے یا ساہتے یا کسی اور نیک بخت کے پاؤں کی خیرات بچ رہا۔

.... اور کیا ننھے کا لہو جوش مارنے سے رہ جاتے گا؟ وہ ہمک کر چلا آئے گا میرے پاس، اور میں کہوں گا۔ ساہتی بیٹا، دیکھ میں تیرے لئے لایا ہوں تندل، اور گڑ، اور کھلونے اور ..... بہت کچھ لایا ہوں۔ ہاں، گاؤں کے لوگوں کا بھی گرہی دعویٰ ہوتا ہے۔ ننھا مشکل سے دانتوں میں بول سکے گا کسی ہرے بھٹے کو، اور جب تنگے سے میری تُو تُو میں میں ہو گی تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں گا۔ بڑا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ کل کی چھوکری اور .... اور .... وہ ناراض ہو جائے گا کہے گا، گھر دیکھوا اپنی بیٹی کو ... پھر میں اس کے بیٹے کو اٹھائے پھروں گا۔ گلی گلی، بازار بازار ...... اور من جائے گا تنگا۔

رحمان نے تلافی کا بندوبست کیا۔ کھڑی کھیتی کی قسم پر کچھ روپے ادھار لئے۔ سوغات باندھی۔ زادِ راہ بھی، اور رستے پر پاؤں رکھ دیا۔ بڑھیا نے اسے اللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا ــــ لبھرے چلا جائے گا علیا چند روز میں میری جینا کو ساتھ ہی لیتے آنا اور میرے ساہتے کو، کون جانے کب دم نکل جائے۔

ملکہ رانی سے نانک پور پہنچتے پہنچتے رحمان نے اسحاق کے لئے بہت سی چیزیں خریدلیں۔ ایک چھوٹا سا شیشہ تھا۔ ایک سیلولائڈ کا جاپانی جھنجھنا جس میں نصف درجن

کے قریب گھنگھرو ایک دم بج اٹھتے تھے۔ مانک پور سے رحمان نے ایک چھوٹا سا گڈریا بھی خرید لیا تاکہ اسحاق اسے پکڑ کر چلنا سیکھ جائے۔ کبھی رحمان کہتا اللہ کرے۔ اسحاق نے دانت اس قابل ہوں کہ وہ بتاشے کھا سکے۔ پھر ایک دم اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ چلنا بھی نہ سیکھا ہو اور عیاں کی پڑوسنیں جیناں کو کہیں ——— نخّے نے تو اپنے ناما کے گڈریے پر چلنا سیکھا ہے۔ اور رحمان نہیں جانتا تھا کہ وہ نخّے کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے یا چھوٹا۔ صرف اس کی خواہش تھی کہ اس کے تندل، اس کے بتاشے، اس کا شیشہ، اس کا تاپانی جھنجھنا اور باقی خریدی ہوئی چیزیں سب سپھل ہوں۔ انہیں وہ مقبولیت حاصل ہو جس کا وہ متمنی ہے۔ کبھی وہ سوچتا کیا جیناں گاؤں کے گنوار لوگوں کے ان تحائف کو پسند کرے گی؟ گیا ممکن وہ محض اس کا دل رکھنے کے لئے ان چیزوں کو پاکر باغ باغ ہو جائے لیکن کیا وہ محض میرا جی رکھنے کے لئے ہی ایسا کرے گی؟ پھر تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ کیا میرے تندل سچ مچ اسے پسند نہیں آسکتے؟ میری بیٹی کو، میری اپنی جیناں کو۔ عیاں تو پڑا پاپیٹ ہے وہ تو کچھ بھی نہیں پسند کرنے گا۔ وہ تو نایک ہے۔ اللہ جانے صاحب لوگوں کے ساتھ کیا کچھ کھاتا ہوگا۔ وہ کیوں پسند کرنے لگا گاؤں کے تندل؟ اور مانک پور سے روانہ ہوتے ہوئے رحمان کانپنے لگا۔

رحمان پر جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کی وجہ سے غنودگی سی طاری ہو گئی۔ رات کے گوشت نے اس کے پیٹ کو شیطان جگا دیا تھا۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی تو تھی ہی، لیکن کچھ سفر کچھ مرغن غذا کی وجہ سے آنکھوں میں سے شعلے لپکنے لگے۔ رحمان نے اپنے بائیں کندھے دبا کر دیکھا وہ جگہ پھر ٹیس سی معلوم ہوتی تھی۔ جیناں کی ماں نے ماچھی گائے کا گوشت پکایا۔ لیکن اس وقت تو اسے دوپٹے لیے ہاتھ پونچھنا اور گائے کا گوشت دونوں

گرفت

چیزیں پسند آئی تھیں

رحمان کو ایک بار پیشاب کی حاجت ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اس کا قارورہ سیاہی مائل گدلا تھا۔ رحمان کو پھر وہم ہو گیا۔ بہرحال، اس نے سوچا مجھے پرہیز کرنا چاہیئے۔ پرانا مرض پھر عود کر آیا ہے۔

گاڑی میں کھڑکی کی طرف سے شمالی ہوا فرانے بھرتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ درختوں کے نظر کے سامنے گھومنے، کبھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے سے رحمان کو گاڑی بالکل ایک پنگوڑے کی طرح آگے پیچھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دو تین سٹیشن ایک اونگھ سی میں نکل گئے۔ جب وہ کرنال سے ایک دو سٹیشن پرے ہی تھا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سیٹ کے نیچے سے گٹھڑی اٹھالی گئی تھی۔ صرف اس کے اپنے گزارے کے لئے تنول اور چادر کے پلو میں بندھے ہوئے کچھ سکے بچے رہ گئے تھے۔ یا اس کے پھیلے ہوئے پاؤں میں گڈریا کھڑا تھا۔

رحمان شور مچانے لگا۔ اس ڈبے میں ایک دو انگریزی وضع قطع کے آدمی اخبار پڑھ رہے تھے۔ بڈھے کو یوں سیخ پا ہوتا دیکھ کر چلائے کہ مت شور مچاؤ، ہمیں پڑھنے دو، مت غل کرو۔ لیکن رحمان بولتا چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک بٹی ہوئی مونچھوں والا کانسٹیبل بیٹھا تھا۔ رحمان نے اسے پکڑ لیا اور بولا تو نے ہی میری گٹھڑی اٹھوائی ہے بیٹا۔۔۔ کانسٹیبل نے ایک جھٹکے سے رحمان کو پرے پھینک دیا۔ اس جھینپ آنے پر رحمان کا دم پھول گیا۔ بابو پھر بولے۔ تو سو کیوں گیا تھا بابا؟ تو سنبھال کے رکھتا اپنی گٹھڑی کو۔ تیری عقل چرنے گئی تھی بابا۔

رحمان اس وقت ساری دنیا کے ساتھ لڑنے کو تیار تھا۔ اس نے کانسٹیبل کی وردی کا

پھاڑ ڈالی۔ کانسٹیبل نے گڈریے کا لٹھا کھینچ کر رحمان کو مارا۔ اسی اثنا میں ٹکٹ چیکر نکل آیا۔ اس نے بھی خوش پوش لوگوں کی رائے کا پتہ دیکھ کر رحمان کو گالیاں دینا شروع کر دیا۔ اور رحمان کو حکم دیا کہ وہ کرنال پہنچ کر گاڑی سے اتر جائے ورنہ ریلوے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ چیکر کے ساتھ لڑائی میں ایک لات رحمان کے پیٹ میں لگی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔

کرنال آ چکا تھا۔ رحمان، اس کی چادر اور گڈریا پلیٹ فارم پر اتار دیئے گئے۔ گڈریے کی لٹھ جسم سے علیحدہ، خون میں بھیگی ہوئی ایک طرف پڑی تھی اور گڑ کے بھیلے کھلی ہوئی چادر سے نکل کر فرش پر ڈھلک رہے تھے۔

رحمان کے پیٹ میں بہت چوٹ لگی تھی۔ اسے سٹریچر پر ڈال کر کرنال کے ریلوے ہسپتال میں لے جایا گیا۔

جینا، ساہتا، علی محمد، جینا کی ماں ...... ایک ایک کر کے رحمان کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ زندگی کی فلم کتنی چھوٹی ہے۔ اس میں بمشکل تین چار آدمی اور ایک دو عورتیں ہی آ سکتی ہیں۔ باقی مرد عورتیں بھی آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔ جینا، ساہتا، علی محمد اور جینا کی ماں ...... یا کبھی کبھار انہی چند لوگوں کے لئے کشمکش کے واقعات ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں مثلاً گڈریا پلیٹ فارم پر پڑا ہوا، اور گڑ کے لڑھکتے ہوئے بھیلے جنہیں خلاصیوں، قلیوں اور سگنل والوں نے آدھا ادھورا چھوڑ دیا۔ بلکہ اٹھا کر غڑپ کر گئے تھے ہونٹ اور ان کے کالے کالے چہروں پر سفید دانت بالکل اسی طرح دکھائی دیتے جیسے اس تاریک سے پلیٹ فارم پر

ان کی ہنسی، ان کے قہقہے...... یا وہ کوئی پالیسی میں اپنی ڈائری میں چند ضروری غیر ضروری تفاصیل لکھ رہا ہو ——

پھر لاسٹ اری......

ویل؟ یہ نہیں ہو سکتا...... اچھا پھر لاسٹ ہاری۔

اور پھر ——

ہسپتال کے سفید بستر سے، کفن کی طرح منہ کھولے ہوئے چادریں، قبروں کی طرح چارپائیاں، عزرائیل نما نرسیں اور ڈاکٹر........

رحمان نے دیکھا اس کی تہ ہوئی والی چادر ہسپتال میں اس کے سرہانے پڑی تھی۔ یہ بھی وہیں چھوڑ آئے ہوتے۔ رحمان نے کہا۔ اس کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ رحمان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اس کے سرہانے کھڑے ہر لحظہ لٹھے کی سفید چادر کو منہ کی جانب کھسکا دیتے تھے....... رحمان کو قے کی حاجت محسوس ہوئی۔ نرس نے فوراً ایک چلمچی بید کے نیچے سرکا دی۔ رحمان قے کرنے کے لئے جھکا اور اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے جوتے پہنے تو جلدی سے چارپائی کے نیچے اتار دیے تھے اور جوتے پر جوتا چڑھ گیا تھا۔ رحمان ایک پیلی سی سکڑی ہوئی ہنسی ہنسا اور بولا —— ڈاکٹر جی! مجھے سفر پہ جانا ہے، آپ دیکھتے ہیں میرا جوتا جوتے پہ کیسے چڑھ رہا ہے؟

ڈاکٹر جواباً مسکرا دیا اور بولا۔ ہاں بابا! تو نے بڑے لمبے سفر پہ جانا ہے، بابا...... پھر رحمان کے سرہانے کی چادر ٹٹولتے ہوئے بولا۔ لیکن تیرا زادِ راہ کتنا ناکافی ہے بابا —— یہی فقط تہ دل اور اتنا لمبا سفر...

. . . . . بس جینا، جینا کی ماں، رسا ہتا اور علی محمد یا وہ افسوسناک واقعہ . . . . .

رحمان نے زادِ راہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیا اور ایک بڑے لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔

کٹی

"۱۶؟"

"جی ہاں —— "تیسری قطار میں" کٹی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا۔ "آپ کو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی صاحب۔ مجھے تو آپ کی مدد کرنے دیجئے۔"

"شکریہ، شکریہ" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے ہوئے ہی اس نے ایک اور چونی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ چونی جیب میں ڈالتے ہوئے کٹی نے آنکھیں بند کرلیں، جیسے اس کا دماغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی تھی اور رات کو اس عظیم الشان سینما میں ٹکٹیں بیچا کرتی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لئے کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بک کر دینے کے عوض اسے چونی دونی زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ایک بوڑھی، بیٹھی ماں تھی جو ہر وقت سینے میں

ذراسی دیر ہو جانے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اس کے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ آگ جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی۔ اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے ....

کچھ دیر بعد مولے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان کونٹر کی طرف آیا اور آہستہ ہی اس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی کونٹر پر بجائیں اور بولا "لیکن ام —— وہاں تو کوئی لڑکی نہیں"

بکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "کہیں باہر ہوگی صاحب ..... اس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا"

"اُف!" نوجوان نے بیزاری سے کہا "ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے بس —— مام ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے"

پھر وہ لڑکا کچھ دور جا کر ساگوان کے خوب صورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے شلز کو دیکھنے لگا اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے آج شب کے سرخ لیبل پھاڑنے شروع کر دیئے۔ پھر بکی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا "مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے"

بکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور دل ہی دل میں اس کے خوب صورت بالوں کو سراہنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں اس کے بال۔ دولت اور فکر میں گھرے ہوئے مجسموں کی طرح وہ گنجا نہیں۔ نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دبلا۔ بس ..... ٹھیک ہے، اور اس کے بال دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بو آتی ہے۔

گُرمن

حالانکہ شاید اُس نے شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے۔ جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب کی بو آنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے اٹھا کر بڑے غور سے سنیما کی چھت کا معائنہ کرنے لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جب سنیما میں روشنی گل ہو جائے گی تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے اور بہت خوب صورت دکھائی دیں گے۔ چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہوگا اور وہ یقیناً اس منظر کو پسند کرے گا اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کہے گا ——— ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور . . .

. . . اور یہ سچ ہے۔ کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں دوڑائی تھی۔ اور نہ قدرت کے اس کلکتہ کو جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا۔ پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اس لئے پسند کرتا تھا کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اس کے دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ بی کو یقین تھا کہ وہ اس بے فکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت رحم دل تھی اور شاید اسی لئے وہ اس کے متعلق اپنے تخیل کو محبت کی آلودگی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ ورنہ اس کے لئے یہ کس قدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر بکنگ آفس کے سامنے [ہاؤس فل] کا بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر خود جا بیٹھتی۔

برآمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا اس لئے نوجوان کے کپڑے کسی قدر

آلودہ ہو گئے لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا۔ گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کئے جانے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سیناگی گھڑی کی طرف دیکھا جو دائیں دیوار سے ہٹا کر منیجر کے کمرہ کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اسی جگہ کو دیکھا جہاں سے وہ اٹھالی گئی تھی۔ بکی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھالی گئی ہو۔ گویا اس کا ادراک اس تبدیلی کو یک بیک تسلیم نہیں کرتا اور شاید اسی لئے اسے ۲۴ پرگنہ کے دیہات میں گزارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے تھے۔ وہ دن جبکہ وہ تہذیب سے دور، دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب . . . . . کلکتہ کے سے مہذب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سطروں کے بٹن پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوانوں کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اسے تنخواہ ملتی تھی۔ اس کی انگلی نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ دور نوجوان کو بکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا۔ جیسے اسے ان کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو اور وہ ان ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہو . . . . . .

چھبیس . . . . . . ستائیس . . . . . . تیس۔ چوتھی قطار . . . . . .

بارہ . . . .

گرہن

——— بکی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جا رکیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول
گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی
بھی تھی ——— مسز ڈی سوزا . . . . . . خاہ! اس کے ساتھ مسٹر ڈی سوزا انہیں
تھے وہ تھے یا نہیں تھے بکی اس ہستی کو سرے سے بالکل بھول چکی تھی۔ اسے نوجوان کی شکل
تک یاد نہ رہی تھی۔ بکی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا تھا کہ وہ اس
چونی کو کوسنے لگی جو اسے اس کام کے لئے ملتی تھی۔

"جنٹلمین" بکی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا "میں نے آپ کی سیٹ چوتھی لائن
میں تیرہ پہ رکھی ہے اور بارہ پر مس ڈی سوزا کی جگہ ہے" اور بکی نے جان بوجھ کر مسز کو مس
کہا۔ آخر قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا اور پھر
بکی کو اپنی جوانی عزیز تھی۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اپنی بہن پر اسے بہت
ترس آتا تھا۔

. . . . . . نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا "شکریہ" اور ہال کے
اندر داخل ہو گیا۔

بکی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر ٹین کا بغور مطالعہ کرنے لگی جب وہ پیٹی
کو اپنے نزدیک سرکا رہی تھی تو ایک خوبصورت سا لڑکا آیا اور اس کے پاس آ کر کھڑا
ہو گیا۔ بکی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی معصوم تھا۔ اس کی مسیں
بھیگ رہی تھیں اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں
جانتا۔ البتہ جاننا چاہتا تھا۔ ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں
دیکھی تھی۔ اور اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا

تھا جو کہ اس کے چہرے کے بھدے نقوش کو اور بھدا بنا رہا تھا۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونی بگی کی طرف سرکا دی۔ بگی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "تم چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟" وہ بولی اور چونی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے ٹکٹوں پر جھک گئی۔ ہاؤس فل تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے لئے پہلے بک کی تھی لیکن ساتھ کی سیٹ میں لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی۔ بگی نے سوچا اب تو وہ لڑکی ضرور وہاں بیٹھی ہو گی۔ کتنی خوب صورت تھی وہ لڑکی —— وہ بلونڈ تھی اور اس کے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی ہو۔۔۔۔۔۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لئے بنائے تھے۔ اس کے پہلو میں اس بے وقوف بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا اس لڑکی کی توہین کرنا تھا اور یہ چھوکرا نو آموز ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔ ہم ۲ نمبر کی طرف جانے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ نہ تو وہ حسن کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہ دے سکتا ہے وہ گدھا تو اصلی ستاروں کو پسند کرتا تھا اور کہیں سے دھان کا ستا اٹھا کر کلکتہ چلا آیا تھا۔

نوجوان لڑکا ایک قدم اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا لیکن سب نشستیں بک چکی تھیں بس سارے کا سارا بگی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا کہ اب اس درجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ نوجوان اپنے اوورکوٹ سنبھالے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے۔

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد موسم ساون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے اور چند چھوکریاں ہوا اپنے گاؤن سنبھالتی ہوئی سینما کی ایگزٹ کی طرف آ کھڑی ہوئیں۔ ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دیئے جاتے تھے اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت بکی کے دل میں اس دیہاتی نوجوان کے لئے ایک عجیب بے باکانہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے 'ہاؤس فل' کا تختہ لٹکا دیا اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی، اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دے دیا اور پھر خود اسے کنڈکٹر تک لے گئی۔ مسلسل کانپتے رہنے سے اس چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کنڈکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ نمبر کی نشست پر بٹھا دیا۔ بکی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی۔ بلانڈ نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا۔ بکی نے سوچا شاید وہ لڑکی بھی میری طرح جذبۂ حسن کی بجائے اپنی جوانی یا دس کے نوٹ کو پسند کرتی ہو۔ اس کے بعد پردے چھٹ گئے اور سینما شروع ہوا۔ انگریزی فلم ——— "میرا نام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے" شروع ہوئی اور گانا ایک دلفریب لحن پر گایا جانے لگا ———

تاروں بھری رات کے نیچے

بکی نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے دل میں لحن کو گنگنانے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے لیکن ابھی دوسرے شو کا ملین بنانا تھا اور ایسے تیز سانس سے تیز

روپے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھک گئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے بچانے کے لئے اسے ہال کا اندھیرا پسند تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے کا دلفریب گانا سن کر اس بدصورت نوجوان کو کیا خوب صورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا ہال کی چھت؟ یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے؟ اس کے بعد بکی باہر نکل آئی۔ کنڈکٹر جانتا تھا۔ کہ بکی، اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لئے پکچر دیکھا کرتی ہے اور پھر فوراً ہی مضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردہ سیمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا جا رہا ہو۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ وہ سکون سے ایک گانا بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے دل کا برتن چھوٹا ہے اور موسیقی کا ظرف بہت بڑا اور نغمہ اس کے چھونے سے دل میں نہیں سما سکتا۔ وہ اپنا چھلکتا ہوا دل لے کر باہر نکل آتی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارہ اسے یاد آجاتا، جہاں اس کی محبت پروان چڑھی اور لٹ گئی۔ جہاں سے ہندو عورتیں اپنا گھڑا بھر کر لے آتی تھیں۔ اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی۔ اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں۔ گائے کے گوبر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے پوتا کرتیں اور بکی کا بھی جی چاہتا تھا کہ ان بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علیحدہ کرنے میں صبر و سکون سے پڑی رہے اور وہاں ہی عورتوں کی طرح چارپائی پہ لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا دیکھا کرے۔

وہ منیجر کے کمرہ کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی۔ کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی۔ ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ بکی نے پھر ایک دفعہ پردہ ہال کے پیچھے سے مولہ اور

اس کے ساتھ کی نشست کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی اجنبی تھے اور اپنی اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ چھوکرا طریقے سے اس خوب صورت خاتون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ لیکن وہ تو گم سم بیٹھا تھا۔

اب اف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا۔ لیکن وہ باہر چلا آیا۔ اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکتا تھا۔ اور اپنے لبوں پر بے تحاشہ زبان پھیرتا اور ان سب حرکتوں سے وہ بالکل ایک اجڈ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

"ہلو مس ——— مام" اس نے باہر نکل کر دوڑتے ہوئے کہا۔

کی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولی "ہلو ——— بولتے انگلش آل رائیٹ دکھو۔ خوب لطف رہا نا؟!"

اس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا "مام ——— میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور .... اور ...." اس کے بعد وہ ہکلانے لگا۔ میرا چچا کدار پور میں دکان کرتا ہے ......"

کی کا جی چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور کی بھی یک لخت پریشان اور اداس ہو گئی۔ اس کے سر میں زیادہ درد ہونے لگا۔ وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ بہت رحم دل تھی۔ اس کے بعد جب شو ختم ہوا تو کی نے منیجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی، بدصورت نوجوان باہر آیا۔ کی اس کے قریب چلی گئی ——— بولی

"ہلو لیو اسٹک ——— تم کہاں کا رہنے والا ہے؟"

گرہن

"ہرش پور ـــــ ۲۴ پرگنہ کا"

"میں جانتی ہوں ہرش پور ـــــ میں ایک دفعہ مسٹر ڈے کے ہاں ایک ماہ ٹھہری تھی۔"

"ڈے ـــ ؟ ہاں ہاں" لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا "میں ڈے کو جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا "آپ اتنی مہربان ہیں ـــ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"ملتی" بکی بولی "لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔ مسٹر ڈے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا۔ اسے مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی۔ وہ لڑکی میری ماں ہے ۔۔۔۔۔۔ اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتا ہے؟"

لڑکے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی "چلو ہم کافی کی ایک پیالی پئیں گے۔"

اور وہ دونوں فرپو، کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دودھیا بلب دور سے چاند کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "دور سے اصلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے۔" نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ ان بلبوں کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتی تھی۔ بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار شاید دودھ کے مٹکے چڑھا لیتا

جاتا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزوں کا آرڈر دیا۔ لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے۔ مارگریٹ پوچھتی۔

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"ساسیج ---- کہو ساسیج"

"ساسیج"

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"کٹلٹس ---- کہو کٹلٹس"

"کٹلٹس"

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا تو مارگریٹ اسے درست کرتی۔ جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نئے نام لینے سکھاتی ہے۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے۔ تو اسے درست کرتی ہے۔ کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس لڑکے نے تمام لیا اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر بل پر رکھ دیئے۔ مارگریٹ کا خیال تھا کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہو گا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ وہ اس بات سے تو واقف تھا۔ لیکن جیسے سینما میں سچ نی زیادہ سے کر عورت کے ساتھ سیٹ بک کروا لینے کا طریقہ اسے کسی نے بتا دیا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر یا کھانا کھا کر اس کے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہو گا۔

مارگریٹ نے بتایا ــــــ کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے، جب یہ بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا۔ تو اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

"ہوا سے، کیا تم آج شب میرے مہمان بنو گے؟ . . . . . میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے . . . . میں تمہیں بتا دوں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا۔ یا جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا۔ یہاں تم اسے نہیں پا سکو گے . . . . . ہاں، تم اس عورت کو دیکھ لو گے، وہ عورت جو کلکتہ ہے!"

اغوا

"آلی......آلی....." دلاور سنگھ نے زور سے پکارا۔

آلی ——— علی جُو، ہمارے ٹھیکے کا کشمیری مزدور تھا۔ منشی دلاور سنگھ کی آواز سن کر علی جُو ایک پل کے لئے رکا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ابھی تک لیموں کی طرح ترش تھیں اور علی جُو کی سرخ، رگوں سے بھری ہوئی آنکھوں نے انہیں پچھنے سے انکار کر دیا تھا۔ منشی جی کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر علی جُو نے نل کا رسہ تھام کر چرخی کو گھومنے سے روک دیا اور بجائے بلند آواز سے بولا ——— "ہو سردار!"

سردار خاموش اور کم گو آدمی تھا۔ آج اس کا خلافِ معمول اونچی اور پرجوش آواز سے پکارنے کا مطلب یہ تھا کہ کنسوا اپنے آبائی گاؤں، جنابا ناکہ گورو ستے واپس آ گئے ہیں۔ دراصل ہم گئے پر کام بدھ اور جمعرات کو اس لئے بھی سست رہا کہ کنسوا

بے بی باپ کے ساتھ شہر سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد بنگلے کی فضا ایک ساکن اور گدلے پانی والے جوہڑ کی طرح ہو گئی تھی۔ لیکن اب کنسو کے آتے ہی ہمیشہ کی طرح ٹھیکہ بٹ گیا ——— دو حصوں میں ——— کام کرنے والوں میں، اور گھورنے والوں میں۔ کام کرنے والے اس کی موجودگی میں زیادہ مستعدی سے کام کرتے تھے اور نکموں کی کسر پوری کر دیتے تھے۔ مزدوروں کے سربراہ منشی جی تھے۔ ان کے چھوٹے سے دستے میں علی جو، رحمان جو، گنی، (غنی) اور رما با وغیرہ شامل تھے اور یا پھر بھی سا، ہتی سا ——— مال ملے گا، ہتی سا کی رٹ لگانے والے بھیّن، ——— پاربتیّن۔ ان لوگوں کے جسم میں کنسو کو دیکھتے ہی ایک بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ دوسری طرف گھورنے والوں میں مزدوروں اور کاریگروں کے علاوہ بابو قسم کے لوگ تھے ——— جھوٹ کیوں کہوں ——— ان میں میں بھی شامل تھا اور ان دنوں ٹھیکے کی چھوٹی موٹی بک کیپنگ کیا کرتا تھا۔ میرے ساتھ ولاں تھے، مختار تھے اور شیخ جی تھے۔

یہ شیخ جی ساٹھ کے تھے لیکن تھے بڑے کائیاں۔ انہیں زلف پہ شب دیگنہ کی پھبتی سوجھا کرتی تھی۔ زندگی کو تو شیخ جی نے بس پی لیا تھا لیکن بقول دلاور سنگھ ابھی "دو گھونٹا" باقی ہی تھا۔ یعنی تھے کاسہ بدست۔ کئی مکمل اور نامکمل رومان ان کے ذہن کی انتڑیوں میں تپ محرقہ پیدا کر رہے تھے۔ شیخ جی عموماً بات یوں شروع کرتے "جب ہم جوان تھے ......"

——— اس کے بعد شیخ جی کی شنوائی نہ ہوتی۔ ہر ایک اپنی جوانی پر مست تھا۔ کم و بیش ہر ایک کی جوانی شیخ جی کی رجعت پسند جوانی سے زیادہ رنگین تھی اور اسے اس پر بجا یا بےجا طور پر ناز تھا۔ چنانچہ "جب ہم جوان تھے ....." کے ساتھ

گرہن

ہی ایک ہڑ حساب ہو جاتا ——

کبھی شیخ جی بھی جوان تھے ؟

پرانی ہو گئی اب شیخ جی کی جوانی ......

ادبے ، کہتا کیوں اسے ...... اسے چپ رَد بے ایمان کہیں !

.... اور جب آوے گدھی پہ جوانی ......

قہ قہ قہ !!!

کنسو کو بھی شیخ جی سے بے حد عقیدت تھی ۔ دراصل کنسو کو ٹھیکے کے ہر آدمی سے انس تھا ۔ وہ ایک پھرکی کی طرح گھومتی ہوئی آتی اور کام چوروں ، مزدوروں کے اس ہڑ میں گھومتی پھرتی ، فقرے چست کرتی گذر جاتی ۔ بڑی ہی جان تھی اس پھرکی میں ، اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہت ہی طاقت ور ہاتھ کی چٹکی نے اسے گھما کر وقت اور مقام کی وسعتوں میں ہمیشہ ہمیشہ آوارہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے اور یہ پھرکی اسی گت سے ساری دنیا تک گھومتی رہے گی اور کبھی دم نہ لے گی ...... آپ بھی کنسو سے باتیں کر رہے ہیں اور مارے شرم کے اپنی جھکی آنکھیں کنسو کے چہرے پر نہیں گاڑ سکتے ۔ آپ بس گھٹنے سے سانگوان یا دیودار میں سوراخ کئے جاتے ہیں اور پھر کبھی ناراض کر برادے کو بس اڑاتے رہتے ہیں ۔ اس کے بعد آپ کا جی چاہتا ہے کہ ایک پل ، ایک چھن اپنے حسین مخاطب کو دیکھ لیں ۔ آپ ذرا گردن پھیرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ کنسو غائب ہے —— غائب ! ہمارے ایک پہیلی ہے —— یہ تھی ، وہ گئی ۔ اس کا حل ہے نگاہ ! اور ظاہر ہے نگاہ کتنی تیز اور دور رس ہوتی ہے ۔ جو دل وجود کو بھی چیر جاتی ہے ۔ اور تب سے آپ اپنا آپ بھی نہیں چھپا سکتے ۔ ابھی وہ

گرہن

یہاں پہونچ کر سنہ کمانچہ اور ساگوانی پرانے میں الجھی ہوئی ہے اور اگلے ہی لمحے وہ اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیتے ہیں اور جہاں درختوں کے زمردیں ملاؤں نے اس ملاپ کی خوشی میں پائل بجا سکے، اپنے بعد سے اور کر یہ پاؤں زمین کی گولائیوں میں چھپائے ناچتے نظر آتے ہیں۔ جہاں آپ کا جسم بھی جانا چاہتا ہے۔ لیکن جا نہیں سکتا کیونکہ جہاں یہ سلطان خلوت کرتا ہے وہاں جسم نا محرم ہوتا ہے۔ جس جگہ جان پہنچتی ہے وہاں تن بدن کا بس نہیں ہوتا۔ کا ریگم دل کی بہن کلثوم بھی ایک پہیلی تھی۔ پلک جھپکنے میں وہ اپنے خلوت خانوں میں گم ہو جاتی اور گنگناتی، علیا، نلی بچہ اور یہی سارا ہی سا لگا لاڈ لشکر منہ اٹھا کر حیران رہ جاتا۔ اگرچہ رائے صاحب نے اسے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ پھر بھی وہ اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی اور گھر کے سب بہت بہت نہال تھے۔

ان دنوں ماڈل ٹاؤن نیا نیا آباد ہوا تھا قطعے بک چکے تھے لیکن تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہر خریدار پہلے اپنی رقم کو دُگنا کا خواہاں تھا۔ رائے صاحب نے پہل کی تھی۔ نئے بنگلے کے ساتھ اس علاقہ میں صرف ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں رائے صاحب شہر سے اٹھ آئے تھے۔ کھلی آب و ہوا میں رہنے پہنچان آتے ہی رائے صاحب کا شہر میں [illegible] سے دم گھٹنے لگا اور وہ اس کوٹھی میں پدھار کر بڑی بے صبری سے بنگلے میں [illegible] کا انتظار کر رہے تھے۔ [illegible] کے لئے شہر سے روسا کی ایک لمبی چوڑی فہرست میں [illegible] زیر ترمیم ہوتی تھیں۔ ان دنوں [illegible] آیا تھا اور رائے صاحب اس کی خبریں پڑھنے سے بہت گھبراتے تھے ...... بس اسی کوٹھی کے سوا دور تک کوئی مکان نہ تھا کہ ایک [illegible] زمین میں لونگ بوٹی اگ رہی تھی۔ کچھ دنوں سے [illegible] مجرد ٹیلے پہ ہی سو جاتے تھے [illegible] کبھی وہیں سویا کرتے ان کی بیوی

وفات پاگئی تھی۔ شیخ اور شیخانی کی زندگی بھر نہیں بنی۔ کیونکہ شیخ جی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شیخانی میری گردن کے نیچے بازو رکھ کر سویا کرتی تھی اور میں نے اس کی گردن کے نیچے کبھی بازو نہیں رکھا تھا ——— اور پھر کنسو کو شیخانی کی وفاداری کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کنسو ہر ایک کی دکھتی رگ سے واقف تھی۔ شیخ جی سے باتیں کرتی تو بے چاری شیخانی کے متعلق۔ مجھ سے بات کرتی تو میری شادی کی ناممکن ممکنات پر اور میری ہونے والی بیوی کی شکل کے متعلق ——— جسے وہ بھابی کہہ کر میرے دل میں ہمیشہ ایک گدگدی پیدا کر دیا کرتی اور علی محمد سے بات کرتی تو کشمیر کے رومانی مناظر اور نمدوں کی تجارت کے متعلق ———
علی محمد درحقیقت مزدور نہیں تھا۔ لیکن ناساعد حالات اور نمدوں کی تجارت کی تباہی نے اسے اس کام کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اب بھی جب کبھی بارش کے بعد فضا کے خاکی ذرات دھل جاتے تو اسے ماڈل ٹاؤن میں پہاڑ دکھائی دینے لگتے . . . اور کنسو جانتی تھی کہ ہر ایک کا چور دروازہ ہوتا ہے اور وہ اس چور دروازے سے ہر کسی کی روح کے اندر داخل ہو جاتی اور اندر سے سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے آتی۔ ہم تینوں لوگوں کے سوا ڈیرے میں تین چار پوربین دھوبین تھے جو اپنی گائیں بھی ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے عارضی طور پر اینٹوں کی کئی بے ترتیب کوٹھڑیاں بنا ڈالی تھیں۔ اور ماڈل ٹاؤن کے اندر ایک اور ماڈل ٹاؤن آباد کر دیا تھا۔ بلا کی عورتیں تھیں۔ ان کی لگائیں۔ کڑاکے کی سردی میں صرف ایک انگیا یا ایک معمولی سی صدری پہنے رہتیں اور چالیس چالیس مکعب فٹ روڑی کوٹ ڈالتیں۔ ان کے مرد حقہ پیتے تھے۔ ہر ٹھیکیدار پیتا تھا اور ہڈیاں خاوند چچوڑتے تھے۔
بھولا ٹھیکیدار تھا جس نے ہمیں سالگرامی پر الاؤ تک جلانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

اگرچہ آگ ان دنوں افیم کے بھاؤ بکتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بسنو سنگھ سردار گھیلا راسے جی، پالا پوس نہ پالا ماگھ ——— پالا ٹھنڈی واسے جی ——— یہ کہاوت ہمیں شیخ جی سنایا کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ ٹھنڈک صرف ہوا سے پیدا ہوتی ہے کہیں دور چھٹانک چھٹانک کے اولے پڑے تھے۔ شیخ جی نے حجامت کے لئے شہر جانا ملتوی کر دیا اور لگے ابر آلود آسمان کی طرف تکنے اور سر پہ ہاتھ پھیر کر، اللہ خیر کا وظیفہ پڑھنے، کوٹھی میں راتے صاحب کی بوڑھی بھینس نے ناند کے ساتھ جسم رگڑ کر جھول گرا دی تھی۔ شیخ جی جھول کو اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ ہمارے پاس آئے۔ آج انہوں نے ایک نئی چیز دریافت کر لی تھی اور وہ یہ کہ لاہور میں رہنے والے لوگ لاہور ہی میں لوگوں کو چٹھیاں ڈالتے ہیں۔ کتنا بڑا شہر ہے لاہور ۔ ۔ ۔ ۔ شیخ جی کی اس دریافت پر مجھے بہت ہنسی آئی لیکن میں بدستور حساب کتاب میں منہمک رہا اور شیخ جی کی پھبتی کے متعلق سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد شیخ جی ٹھٹکتے ہوئے برآمدے کے قریب آ گئے اور کچھوے کی طرح جھول میں سے گردن نکال کر بولے

"کنسو بہت ہی جوان ہو گئی ہے"

اب یہ بات بھی لاہور کے ایک بڑا شہر ہونے کی طرح ایک دریافت تھی۔ لیکن کنسو کا نام سنتے ہی غنی جو، رحمان جو، اور گنی دتی کے کان کھڑے ہو گئے۔ دراصل لاہور کی تمہید اسی بم کے گولے کے لئے تھی لیکن تمہید اور حرف مطلب میں اتنی بے تعلقی تھی کہ لاہور کی چٹھیوں کے بعد بے وقوف طبقہ کے سب آدمی اسے ضمنی بات سمجھ سکتے تھے۔

تین چار آدمیوں کو اکٹھے ہوتے دیکھ کر کاریگروں نے بھی اڈوں پہ دم لیا

اور اِدھر چلے آئے۔ دلاور سنگھ نے پھر نل پہ بلانے کے لئے دور سے پکارا ——
"آلی...... آلی...... رتنے" اور اس کے بعد خشت درجہ اول کی مت ہم پر پھبتیاں اٹھاتے شیخ جی کو طنزیہ سلام جگا نے خود بھی اِدھر چلا آیا۔ جمعدار رام آسرے نے بھی زندگی بھر نہ ٹوٹنے والے پیکا ہیری جوتے سرکائے اور قریب آ گیا۔ علی جُو نے اپنے کشادہ ہاتھ پاؤں پھیلا کر گدھے کی طرح ایک لمبی اور بے ڈھنگی سی قلابازی بھری اور گنّی کو اپنے پنجوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ گنّی بولا۔ پرے ہٹ ہاتو۔ علی جُو لفظ ہاتو سے بہت جلتا تھا۔ کیونکہ ٹھیٹ پنجابی اصطلاح میں ہاتو بوجھ اٹھانے والے کشمیری کو کہا جاتا ہے۔ اور علی جُو کوئی لدو جانور تھوڑے ہی تھا۔ علی جُو نہ تو مزدور تھا اور نہ ہی مالک۔ وہ تو خوب صورت لفظوں میں لکھا ہوا ایک المیہ ڈراما تھا جو فردوں کی تباہی پر ختم ہوتا تھا۔ علی جُو کا جسم ترکستانیوں کی طرح سڈول اور تنومند تھا۔ اِدھر پنجاب میں محنت کر کے اس نے اچھے پیسے جمع کر لئے تھے اور اب دوبارہ مولا پہنچ کر اپنی زندگی کا سفید حصہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علی جُو نے گنّی کو پٹخنی دی۔ مارنے والے نے مارا، سہنے والے نے سہہ لیا۔ بات جاری رہی جو مارنے اور سہنے سے زیادہ دلچسپ تھی۔ دلاور سنگھ بولا:

"بد معاش ہے سالی"

علیا بولا "عجب خدا کا! اسے روکتا بھی کوئی نہیں۔ کئی دفعہ تو بڑی ہی دیر سے گھر آتی ہے جب ہم شام کو گھر جاتے ہیں۔ تو اس کا تانگہ ہمیں نہر پہ ملتا ہے"

"خبر نہیں کتنے یار رکھے ہوئے ہیں اس چھوکری نے"

"مجھے تو بھاگتی دکھے"

"کسی کے ساتھ دیکھی بھاگتی ہے؟"

"جو بھی کوئی لے جائے —— جوانی آفت پہ آئی رہی ہے"

اور سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ کنسو بھاگ جانا چاہتی ہے۔ سب اپنا اپنا تعویذ چمکانے لگے۔ شیخ جی نے اپنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرا اور بولے "تم سب غلط کہتے ہو۔ وہ نہیں بھاگے گی۔ کم سے کم میرا تو سولہ بسوے یہی کھیال ہے۔"

کنسو کے طور اطوار سے تو مجھے بھی یہی شک ہوتا تھا کہ وہ چلن کی اچھی نہیں اور اسے کوئی بھی بھگا کر لے جا سکتا ہے۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو شیخ؟" میں نے معاً سوال کیا۔

"کم سے کم ان دنوں تو اس کی باتوں سے مجھے کوئی شک نہیں ہوتا!"

"کیسے؟"

"جانتا ہوں —— بس کہہ جو دیا" شیخ نے سر ہلاتے ہوئے ایک بے معنی سا جواب دیا۔ سورج کی شعاعوں میں اس وقت تک شبنم کی سی مٹھاس پیدا ہو گئی تھی اور علی جہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیخ جی کے منہ کی طرف دیکھ سکتا تھا اور سوچ سکتا تھا۔ اتنی بھی کیا ٹھنڈک لگ رہی ہے شیخ کو، یہ سالا بھینس کی سی جھول لپیٹ چلا آیا۔ گنی اس وقت بچھوؤں کا شکار رہی معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کا جی چاہتا تھا کہ جھول میں سے نکلی ہوئی گردن کو پکڑ کر مروڑ ڈالے۔ کنسو سچ مچ تھوڑے ہی بھاگ چلی تھی۔ ذرا ایسی باتوں سے مزا ہی لے لیتے۔ شیخ جی کی اس بے دلیل قطعیت —— بس کہہ جو دیا، پہ مجھے بھی غصہ آ رہا تھا . . . . .

کائیں، کائیں، کائیں۔ آسمان کے آخری کوّے چھانگے مانگے کے جنگل کی طرف جا رہے تھے اور اپنے پیچھے آوازوں کی غیر مرئی لکیریں چھوڑتے جاتے تھے۔

"بٹلے بابو!" جمعدار رام آسرے کی بیوی رام دتی نے آواز دی اور جب رام آسرے

نہ جا تو ٹوکری کو پھڑاں میں رکھ کر سر کے اتو کو اس پر پھینک دیا اور آپ کو غصہ ٹھنڈا تو ہونے اپنے اندل ٹاڈان کی طرف چلی گئی۔ دلاور سنگھ خشت درجہ اول کی پرچیاں کو بہرے تخت پوش کے صندوقچے میں بند کر کے تالا لگاتے ہوئے بولا "آج شیخ جی نے بہری تو پایا ڈھینگ پالی ہیں۔"

"بیکار سے سے بڑھا تو" پوہنیا بولا۔

عجیب بات تھی سب کنبہ کا بھاگ جانا پسند کرتے تھے۔ میں نے مزدوروں کی وکالت کرتے ہوئے کہا "بابا! اماں باوا کی اتنی بے پروائی رنگ تو لاتی ہی ہے۔ یہ جتنی کھل کھیلنے والی چھوکریاں ہوتی ہیں یہ سب بدمعاش ہوتی ہیں" لیکن اندر ہی اندر میں شیخ جی کے تجربے کا قائل تھا۔ عموماً بڈھے لوگ لڑکیوں کو آزاد دیکھ کر اس قسم کے فتوے صادر کرتے ہیں لیکن یہ بڈھا اس کے برعکس باتیں کر رہا تھا۔ اور پھر اس نے اتنی قطعیت سے اعلان کیا۔ آخر جب دلاور نے مجبور کیا تو شیخ شروع ہوا "دیکھو سردار جب ہم جوان ۔۔۔"

کائیں، کائیں، کائیں —— زمین کے آخری کوؤں نے شور مچا دیا اور گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سندر سنگھ ترکھان نے اندر جوری میں ڈالے اور ہو ہو ہو کرتا رام آسرے پر ٹوٹ پڑا۔ رام آسرے کی پچاس گز لمبی پگڑی کھل کر گلے میں جا پڑی۔ اس نے ترکھان کی پگڑی اچھال دی۔ سردار کا جوڑا کھل کر ہوا میں لہرانے لگا ۔۔۔۔ چلو گھر چلیں شیخ پھر سے جوان ہو رہا ہے —— راستہ چھوڑ دو ورنہ زخمی ہو جاؤ گے ۔۔۔۔ آلی ۔۔۔۔ آلی ۔۔۔۔ للی ججو کی بے آواز ہنسی سے صرف فتی ۔۔۔۔۔۔ فتی کی آوازیں آئیں۔ ادے نہیں پڑیں گے شیخ جی۔ نہ اسک حجامت بنوائیں —— کوئی بولا اور سب اپنے اپنے چھاتے ٹانگے کو پدھارے۔

اس وقت اندھیرا میدان اور لونگ بوٹی پر رینگ رہا تھا۔ سعد ایروڈروم میں ایک ہوائی جہاز اترتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی دم کا چمکتا ہوا نقطہ ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح تیزی سے زمین کی طرف آرہا تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے ستارے کو دیکھ کر اندرونی ماڈل ٹاؤن سے رام دئی یا اس کی کوئی بہن بولی ...... رام رام ... رام رام ...

میں سوچنے لگا۔ آج مجھے شب بھر نیند نہیں آئے گی —— باتوں باتوں میں ان رمالوں نے آج کیا پتا خرچ چھوڑ دیا۔ کیا کنسو کی شکل اس کی ہوائی جہاں کی شکل سے تو نہیں ملتی؟ اور میری رگوں میں خون کا دورہ تیز ہو گیا۔ میں نے کہا اب میں متواتر دودھ نہیں پیا کروں گا۔ اس سے میرے جسم میں بہت ہی جان آجاتی ہے۔ پھر مجھے ہنسی آنے لگی ہی ہی ہی ....

صبح اٹھ کر میں نے پاجامہ بدلا۔ بہت گندہ ہو چکا تھا پاجامہ اور قمیص بھی میلی ہو رہی تھی۔ ابھی بمشکل دس ہی بجے ہوں گے کہ کنسو پھر گھومتی پھرتی آئی اور شیخ جی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی پاکیزگی کی طرح سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن میں نے سوچا کہ ان کپڑوں کے اندر سفیدی کی بجائے سرخی ہے۔ گرم گرم لہو کی سرخی۔ کنسو کے بالوں اور دوپٹے کی متوازی لکیریں اپنی اپنی ہوئی سیاہیوں اور سفیدیوں کے ساتھ بے پروایانہ انداز سے پشت کی پگ ڈنڈیوں اور شاہراہوں پر رواں دواں تھیں۔

شیخ جی نے پوچھا۔ ”جنڈیالے سے کب آئیں تھیں تم بیٹی؟“

”کل ہی تو آئی تھی بابا ......“ کنسو بولی ”جنڈیالے میں میرا چچا مر گیا تھا بابا۔ بات سناؤں تمہیں اس چچا کی؟ بچارہ سٹیشن ماسٹر تھا“

شیخ جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا ”میرا داماد سٹیشن ماسٹر ہے۔“

کنسو نے میری طرف دیکھا۔ یہ شیخ جی کے خلاف میری اور کنسو کی سازش تھی۔ میں

نے مسکراتے ہوئے کہا۔ چونے کی کھڑی گاڑیاں —— بہتر روپے آٹھ آنے . . . . .
"کنسو نے کہا" میری بات تو سنو، بابا!"

بابا سننے لگا . . . . . "ساری عمر لاہور میں رہا بیچارہ۔ وہیں کالجوں اسکولوں میں لڑکے پڑھتے تھے۔ وہ بس ہوتے چچی مرگئیں شیخانی کی طرح لیکن وہ بچوں کے ساتھ دل بہلا لیتے تھے۔ اس کے بعد تبدیلی ہوگئی شور کوٹ روڈ۔ وہاں کوارٹر ملا تو اتنا بڑا کہ چار کنبے رہ جائیں۔ رات کو مکان بھائیں بھائیں کرتا۔ اس میں چاچا اکیلے ٹانگیں پسارے پڑے رہتے۔ لیکن وہ زندگی بھر اکیلے نہ رہے تھے۔ بڑے لڑکے کی شادی کے بعد بہو کو رونق کے لئے لے گئے۔ بھابی کو شور کوٹ والوں نے سر پہ اٹھا لیا ——
بڑے بابو کی بہو، بڑے بابو کی بہو —— بہو کو آئے مہینہ بھر نہ ہو پایا تھا کہ بیٹے صاحب آدھمکے —— اب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور پھر تم جانتے ہو رونی کی کتنی تکلیف ہو جاتی ہے۔ بہو بھی اتاولی سی تھی۔ ٹرنک وغیرہ اٹھوا چلی گئی۔ چچا بہت روئے، بہت روتے . . . . . خطوں میں لکھتے ہیں بیٹے کو —— بہو کے آجانے سے مجھے تمہاری ماں کے دن معلوم ہونے لگے تھے۔ وہی رونق، وہی . . . . . لیکن، لیکن تمہارے ہاں تو کوئی بیٹا بھی نہیں ہے جس کی بہو تم لے آؤ . . . . ."

شیخ جی بولے "بیٹا! . . . . . میں بھی زندگی بھر اکیلا نہیں رہا۔ اب یہاں کھٹیلے پہ ٹانگیں پسار کر سوتا ہوں تو ساری دنیا بھائیں بھائیں کرتی نظر آتی ہے۔ شیخانی کے دم سے بڑی رونق تھی۔ وہ یوں غریب تھی لیکن نسبت کی بہت امیر تھی شیخانی —
یہ کون ہے —— یہ داماد آرہا ہے؟ یہ کون ہے اس کے چچیرے بھائی کی بی بی ہے، یہ کون ہے رجانی کی بیوہ ہے . . . . ابھی چلتے بن رہی ہے

ابھی اخروٹ منگوائے جا رہے ہیں۔ ابھی دُھنیے نے چار لحاف تیار کر دیے ہیں اور میں کماتا اور کھپتا مرجاتا۔ اب میں کس کے لئے کماتا ہوں کس کے لئے کھپتا ہوں۔ اب میرا کون ہے . . . . ؟

اور شیخ جی کا گلا رندھ گیا۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا جو دکھ بھرے دل سے یہ کہے کہ اس سنسار میں میرا کون ہے ؟ اور پھر اس سے آگے کچھ کہہ پاتے۔ اتنا بدنصیب کم ہی ہوتا ہے کوئی۔ اگر شورکوٹ میں اس کا کوئی نہ ہو تو لاہور میں ہوتا ہے۔ لاہور میں نہ ہو تو ماڈل ٹاؤن میں . . . . . . لیکن شیخ جی کا تو چھانگے مانگے میں بھی کوئی نہ تھا۔

کنسو شیخ جی کو رلا کر رُل گئی اور میرے قریب آ کر بولی "دراصل بات یہ ہے میرا کوئی چچا وچا نہیں ہے"

—— اور اُدھر کے پاس ابھی تک شیخ اپنی پگڑی کے شملے سے آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ میں نے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کے بعد کنسو بولی۔ میں نے جنڈیالے میں بھائی پسند کر لی ہے۔ میں نے کنسو کے تل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہاں! اس کے بائیں گال پہ تل ہے۔ وہ رات کو خواب میں میرا سب مال و متاع لوٹ کر لے گئی۔ کنسو نے مجھ پر برادہ اچھال دیا۔ کوٹھی سے آواز آئی۔ کنسو! کنسو کی نانی کی آواز تھی۔ جو ہمیشہ سے بے سود التجا کیا کرتی کہ کنسو اپنے دوپٹے سے سر ڈھانپ لے۔

اس کے بعد کنسو علی جُو کی طرف مخاطب ہوئی۔ علی جُو اس وقت نل کے رسے کو چھوڑا چاہتا تھا "ہو سردار!" اس نے منشی جی کو بلاتے ہوئے شکستہ پنجابی میں کہا "اب کتنا چلا گیا اندر؟"

نل پندرہ فٹ کے قریب زمین میں جا چکا تھا۔ دلاور بولا "ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ زمین کچھ پتھریلی ہے۔ کر بہت محنت سے ٹوٹے گا"

زمین کے اندر سے بہت سے چھوٹے چھوٹے سفید پتھر باہر آ رہے تھے۔ علی جو رسے کو کھینچتا تو اس کے پٹھے تن جاتے تھے۔ کنسو بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی رہی اور علی جو کے تنومند جسم کو دیکھتی رہی۔ علی جو اس وقت سورج کی پہلی کرنوں میں تمتما رہا تھا۔ نو زائیدہ بچے کی طرح وہ سر سے پاؤں تک خون کا ایک بڑا سا قطرہ دکھائی دیتا تھا۔ ٹوپی کے باہر اس کے بالوں کی سرخ گھنگھریالی لٹوں کے کنارے سنہری ہو رہے تھے۔ چھاتی پر اڑسے ہوئے چیتھڑوں میں سے اس کا نصف، تنا ہوا سینہ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ کنسو نے بغلوں میں ہاتھ دے لئے اور دیکھتی رہی، دیکھتی رہی۔ پھر علی جو سے بولی:

"ارے ہاتو! بارہ مولے کب جا رہے ہو؟"

"جد پیسے ہو جاندےسیں (جب پیسے ہو جائیں گے)"

"جو پیسے میں دے دیندیسیں (اور جو پیسے میں دے دوں تو؟)"

"آ بھی' ہو نے جاندےسیں (ابھی اسی وقت چلا جاؤں گا)"

علی جو نے ہاتو کے لفظ کا برا نہیں منایا کنسو چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آتی اور ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتی ــــــ ٹھیکہ بنتا رہا ہم بھی شیخ کے نقطۂ نگاہ کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے۔ کنسو بہت آزاد لڑکی ہے۔ وہ یونہی ہر ایک سے ہنس کھیل لیتی ہے۔

اس وقت عمارت کھڑکیوں کی کارنس تک پہنچ چکی تھی۔ ہمارا عملہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

کارنسوں سے دور قطے اوپر اٹھنے پر ایک خوش پوش نوجوان کسی الیکٹریشن کا بورڈ لے آیا۔ اور اسے بلاک کے ساتھ والی سڑک کے کنارے شیشم کی چھاؤں اور ٹانڈوں کے سامنے گاڑ دیا۔ اس پر لکھا تھا "الیکٹرک انسٹالیشن بائی راج اینڈ کمپنی" اس کے بعد تاروں کے گز کھد ھندے، الگیاں اور سفید سفید کٹ آؤٹ آنے لگے۔

ایک دن پھر شیخ جی میرے پاس آئے۔ آج پھر انہوں نے بھینس کی جھول لپیٹ رکھی تھی۔ جب وہ کبھی بہت رازدارانہ لہجے میں بات کرنا چاہتے تھے تو وہ بھینس کی جھول لپیٹ لیتے تھے۔ میرے پاس آتے ہی بولے۔

"اب کنسو بھاگ جائے گی۔"

میں نے کہا "ہیں؟"

"تم نے کچھ تبدیلی دیکھی ہے؟"

میں سوچنے لگا۔ میں نے کیا تبدیلی دیکھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تبدیلی؟

"کیا تبدیلی؟" میں نے شیخ سے پوچھا۔

"بس اب دیکھنا"

"بتاؤ تو"

"بس کہہ جو دیا دیکھنا"

"پھر بھی" . .

"بس کہہ جو دیا میں نے"

میں نے سپٹا کر زیادہ کرید نہ کی۔ دوپہر کو جب کنسو باہر نکلی تو وہ قدرے سہمی، شرمائی ہوئی تھی۔ یوں تو اس نے ہر ایک کے ساتھ باتیں کیں لیکن آج ان میں کچھ

اکھڑا ہوا سا تھا۔ دلاور سنگھ، شیخ جی، سندر سنگھ، علیا، گنتی، بجلی کے مستری سبھی کے ساتھ وہ بولی۔ لیکن علی جو کے پاس سے گزر گئی۔

شیخ نے کہا "تم نے دیکھا؟"

میں نے کہا "ہاں شیخ، میں نے دیکھا۔"

اس کے بعد ہم شام تک گھبرائے ہوئے ادھر ادھر پھرتے رہے۔ شیخ جی اور میں۔

آج کا دن مبارک تھا۔ آج علی جو نے زمین کا پتھر ہلا کر توڑ ڈالا تھا اور نل زمین میں پانی تک پہنچ گیا تھا۔ نلکے کے مستری نے کڑ ٹوٹنے کی خوشی میں بتاشے تقسیم کروائے....

علی جو فارغ ہو چکا تھا اور آج رات وہ چلا جانا چاہتا تھا۔

شام کے قریب جب مزدوروں کے گھر جانے لگے تو ہمیں بڑے صاحب کی تلاش ہوئی۔ اس وقت اینٹوں کی آڑ میں سے شیخ جی نے مجھے کچھ دکھلایا ـــ وہ دیکھو .... سامنے علی جو کھڑا تھا۔ کوٹھی کا ایک دروازہ بالکل معمولی طور پر کھلا ہوا تھا اور کسنو علی جو کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی!

غلامی

آخر تینتیس سال کی طویل ملازمت کے بعد پنشن پا کر پوہو رام گھر پہنچا گھر کے سب چھوٹے بڑے اس کے منتظر تھے اور اس کی بیوی سرسوں کا تیل لیے کھڑی تھی۔ پوہو رام آئے اور وہ دہلیز پھاندنے سے پہلے چوکھٹ پر تیل گرا دے اور پھر دست اپنے بڑے بیٹے کو اشارہ کرے کہ وہ پھولوں کا ہار اپنے بوڑھے باپ کے گلے میں ڈال دے۔ چنانچہ سرسوں کا تیل گرانے کے بعد ہاروں سے لدے پھندے پوہو رام کے گلے میں نوبت سنگھ نے بھی ایک ہار پہنا دیا۔

چوکھٹ پر قدم رکھتے ہوئے پوہو رام سوچ رہا تھا، یہ پھول کتنے دور دور سے آئے ہوں گے اور چتیرے نے ان سب کو ایک تاگے میں پرو دیا ہوگا اور ان پھولوں کی قسمت میں بدا ہوگا کہ وہ میرے گلے کی زینت ہوں ——— میری عزت افزائی کے

رہے ایک جا ہوں ...... اور دفتر میں کتنے بابو اکٹھے ہو رہے تھے۔ کرنی میانوالی کا ہند تھا کوئی بھمبر کا بٹ ــــ گویا دور دور سے آئے ہوئے پھول تھے اور تعداد کے پھیلے رستے انہیں یکجا کر دیا تھا۔ میری زینت کے لئے، میری عزت افزائی کے لئے!

پولھو رام کا ریٹائر ہونا بھی ایک ڈراما تھا۔ نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہ گھر آنے کے لئے سڑک پر ہو لیا تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ سبکدوش ہو چکا ہے۔ وہ اس سرمئی سیاہ سڑک جس پر سینکڑوں مرتبہ دفتر کو آیا ہے، اب مہینے میں ایک بار آیا کرے گا ــــ پنشن پانے کے لئے ...... فٹ پاتھ پر پاؤں رکھتے ہوئے اس نے پس پشت دفتر کی خوبصورت، گوتھک قوسوں کی طرف دیکھا۔ پیشانی میں بڑا کلاک بگڑا ہوا تھا ...... "جیسی!" پولھو رام نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے "سالا روز اول ہی سے بگڑا ہوا ہے۔ کبھی ٹھیک نہیں ہوا۔ جب میں نیا نیا ڈاک کے اس محکمہ میں ملازم ہوا، تب بھی ایک گھڑی ساز گھنٹے کی سوئی کو منٹوں کی سوئی سے نجات دلانے کے لئے کلاک تک پہنچنے والی سیڑھی پر رینگ رہا تھا۔"

سیتا نے سوچ میں مستغرق شوہر کے شانے کو چھوتے ہوئے کہا: "چھوٹی بہو آئی ہے ...... اور بدھائی دیتی ہے۔"

پولھو رام سکڑ گیا اور جذبات کی ایک لطیف رَو میں بہہ گیا۔ "چھوٹی بہو بدھائی دیتی ہے ...... چھوٹی بہو بھی بڑی اچھی۔ دونوں بڑی بہو سے اچھی ہے، اس کی رگوں میں شرفا کا خون دوڑتا ہے۔ بڑے بیٹوں کی شادی کے وقت میں اتنا متمول ہی کہاں تھا کہ کول خاندان سے رشتہ کی توقع رکھتا۔"

اور جب سینو نے پولھو رام کو ہار اتار دینے کے لئے کہا تو پولھو رام گھگھری کی سی آواز پیدا کرتے ہوئے ہنسا اور بولا "ہاں، نوبت کی ماں...... یہ بھی میری طرح اپنی نوکری سے سبکدوش ہو چکے ہیں...... ہی ہی...... گویا انھیں بھی اب پنشن مل جانی چاہیئے...... ہی ہی ہی......"

دیئے جلنے پر لال چوک کے بہت سے آدمی مبارکباد دینے کے لیے آئے پولھو رام کے ہاں ایک کنواں تھا جس کا آدھا حصہ لال چوک میں کھلتا تھا مسلمانوں اور دلت جاتیوں کے سوا لوگ اس میں سے باہر ہی سے پانی لے جاتے تھے۔ جب لال چوک کے آدمی آئے تو پولھو رام کنوئیں کے اندرونی منڈیر کے پاس ایک خالی جگہ کو دھوتے ہوئے اس میں ٹھاکروں کو استھاپن کر رہا تھا...... اب جب کہ وہ نوکری سے فارغ ہو چکا تھا وہ صبح و شام ٹھاکروں کے سامنے کرتالیں بجایا کریگا اور برہمانند کے بھجن گائے گا۔ پینتیس برس کی طویل ملازمت میں پوجا پاٹ کی فرصت ہی کہاں تھی!

پھر اس نے لال چوک کے آدمیوں کو بتایا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے صاحب کی دھونس نہیں سہتا تھا۔ ہارڈیگ صاحب سے تو اس کی لڑائی ہی ہو گئی۔ ایک نوٹ کا چھوٹا سا معاملہ تھا۔ ان دنوں وہ سلیکشن گریڈ کا پوسٹ ماسٹر تھا اور اس گریڈ کے پوسٹ ماسٹر کی بڑی طاقت ہوتی ہے۔

"میں نے ہارڈیگ صاحب سے کہا" پولھو رام بڑی تمکنت سے سٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا...... "کیا آپ اس معاملہ میں دخل دے کر میری طاقتوں کو رد کر سکتے ہیں؟" پر ہیٹے تو وہ نہ مانا اور معاملہ پوسٹ ماسٹر جنرل تک جا پہنچا۔ جیت مجھی کو ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہی صاحب میرے دفتر کے معائنہ کو آیا۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ اس مخاصمت

کرنل صاحب بہت کچھ میرے خلاف لکھیں گے جس سے میری پنشن میں فرق پڑ جائے گا اور کیا عجب ہے مجھے ڈی گریڈ یا اَن فٹ ہی کر دے۔ لیکن اس نے میری غیر معمولی تعریف کی ...... جناب یہ انگریز لوگ بہت فراخ دل ہوتے ہیں۔ یہ بہادروں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ پرانے کینہ جھگڑوں کو بھول بھال جاتے ہیں۔ میں نے بچپن میں جغرافیہ یا شاید تاریخ میں پڑھا تھا کہ انگریزی راج میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ...... اگرچہ میں اس کا مطلب نہیں جانتا تاہم میری دعا بھی یہی ہے کہ انگریزی راج میں سورج کبھی غروب نہ ہو ...... اور دیکھئے، بخلاف اس کے کہ اگر کہیں دیسی افسر ہوتا تو نہایت کمینگی سے پیش آتا۔ میری زندگی تباہ کر دیتا۔ ایشور کرے ان دیسی لوگوں کا سورج کبھی طلوع نہ ہو۔

شام کو جب بابو رام کھانا کھانے کے لئے بیٹھا تو اس کے بیٹے، اس کی بہوئیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ خدا جانے کس نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔ غالباً چھوٹی بہو ہی نے چھیڑا ہو گا۔ وہی کرنل خاندان کی دھرکی تھی۔ اپنی ننھی بچی کو ان کا کوٹ پہناتے ہوئے بولی: "اور دادا مجھے تو حیران ہوتی تھی، پتا جی کیسے کڑاکے کی سردی میں سویرے ہی نہا لیتے تھے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ایک بھی تو ناغہ نہ ہوا؟"

بابو رام انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا: "بیٹی نوکری کا بہت پابند تھا بیٹا! اور ان پینتیس سال کے عرصے میں کوئی ہی ایسا موقع ہو گا جب کہ میں نہایا نہ ہوں اور نو بجے نہا کر دفتر نہ چلا گیا ہوں۔ میرے سب افسر مجھ سے بہت خوش تھے۔"

منجھلی بہو بھی کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ بولی: "ہم جوانوں سے تو پتا جی اچھے ہیں دیکھئے تو ہم اب بھی کیسے کھاٹ پکڑے رہتی ہیں۔ آٹھ بجے سے پہلے کروٹ نہیں

باتیں (اور) آپ ہیں کہ اوپرے پڑے پر بھی نہا لیا اور جھٹ سے کام پر بھی چلے گئے۔"

پلہو رام دمینتی کو اس طرح دیر سے اٹھنے کی عادت پر بہت لعن طعن کیا کرتے تھے لیکن اس وقت وہ نہاتے ہوئے کتے کی طرح پھول گئے۔ بولے: "بیٹا! تمہیں کاہے کی فکر ی؟ ہمارے جیتے جی خوب ہنسو، کھیلو، سوؤ ...... جیسے تمہارے ماں باپ میکے میں تھے ویسے یہاں بھی ہیں۔"

بڑی بہو کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ پلہو رام نے پردے کی وجہ سے نہیں دیکھا لیکن سینتھ نے بہو کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ لیں۔ کہاں تو وہ ترنی بہو سے لڑتی ہی رہتی تھی۔ کہاں اس نے برتن مانجھنے چھوڑ کر اپنے راکھ سے آلودہ ہاتھ جھاڑے اور ہاتھوں کو بہو کی کمر میں ڈالتے ہوئے بولی: "اوری پگلی! جھوٹ کہتے ہیں؟ تم کیا جانو ہم تمہیں کتنا پیار کرتے ہیں ...... بس ذرا تمہاری زبان قابو میں ہو جائے نا ...... نہ جانے اس وقت کیا ہو جاتا ہے تمہیں!"

دمینتی بڑی شردھا سے بولی: "میں تو بنتی کرتی ہوں ایشور سے ..... کہ آپ کا سایہ سات جنم تک ہمارے سر پر قائم رہے۔ آپ ہماری بہتری کا پیار بھی تو کرتے ہیں۔ جو پیار کرے وہ مارے، جھڑکے لاکھ بار ......"

جانے چھوٹی بہو کو رشک آیا۔ بولی: "پتا جی نے مجھے پریاگ لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔"

اب تک پلہو رام بابو دمینتی کے جذبات کو جان چکے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ وہ کہنے لگے: "چھوٹی بہو کو ضرور پریاگ لے جاؤں گا۔ ہاں تو بیٹا کی ماں! میں نے اس سے وعدہ کیا ہے اور بڑی کو بھی لے جاؤں گا اور ..... پھر کیا تم

پیچھے رہ جاؤ گی زینت کی ماں، کھلے موسم میں سبھی کو لے جاؤں گا......"

—— اور پوہو رام کے لب و لہجہ سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ سب کو پر لگ ہی تو لے جائے گا۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی اس بات کی حقیقت سے واقف تھی۔ جب وہ نئی نئی بیاہی آئی تھی تب بھی تو پتاجی نے کنگن کا وعدہ کیا تھا اور اب کہاں گیا وہ وعدہ؟

اگلے دن پوہو رام بالو کی آنکھ پانچ بجے کھل گئی۔ اس نے سوچا وہ اتنی جلدی جاگ کر آخر کیا کرے گا؟ اس نے ایک ہاتھ سے زنگپوری چھینٹ کا پردہ اٹھایا اور دریچے کے شیشوں میں لال چوک کی طرف جھانکا۔ کمیٹی کی بتیوں کو بجھانے کے لیے کمیٹی کا ملازم سیڑھی کندھے پر رکھے، آہستہ آہستہ پاٹ شالا کی طرف جا رہا تھا۔ بتیاں کی بے بضاعت روشنی میں پڑے، ایک بھینسا گاڑی اپنی تمام ہندوستانی سست رفتاری سے رینگ رہی تھی، ان گاڑیوں کے لئے نیو میٹک ٹائر ہم پہنچانے کی قرارداد برسوں سے کمیٹی میں پیش ہو رہی تھی اس کے باوجود کمیٹی اور بھینسا گاڑی دونوں کی خواہش تھی کہ وہ دن ہونے سے پہلے پہلے شہر پناہ سے باہر ہو جائے پوہو رام نے اپنا منہ لحاف میں لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور معمول کی طرح بولا: "سیتے، اٹھو نا مجھے چائے بنا دو۔"

سیتو روزمرہ کی طرح چائے بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن جیسے ہی اس کے پاؤں ٹھنڈی کھڑاؤں میں داخل ہوئے اسے کچھ یاد آ گیا۔ بولی: کدھر جا رہے ہیں آپ؟ ...... کوئی دفتر تو نہیں جانا ہے پڑے رہیئے چپکے سے......"

پولھو رام بابو بولا: "کدھر جا رہا ہوں میں؟... ہا ہا؟ ارے میں لنگی! سیر کرنے بھی نہ جاؤں؟"

لیکن ستو نے تو شاید سوچا تھا کہ ان کے پنشن پانے پر وہ بھی صبح کی چائے کے جھنجھٹ سے چھوٹ جائے گی اور اپنی بہوؤں کی طرح بڑے مزے سے اپنے خاوند کے پہلو میں پڑی رہے گی۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا ___ پنشن تو صرف مردوں کو ملتی ہے، کبھی عورت کو بھی پنشن ملی ہے؟ ___ گھر میں تو روز نوکری ہوتی ہے اور روز پنشن...... اسے اٹھنے میں بہت دقت پیش نہ آئی ___ پولھو رام نے اسی وقت کپڑے اتارے اور معمول کی طرح جلدی جلدی پانی کے کچھ ڈول نکال کر جسم پر انڈیل لیے۔

چائے پینے کے بعد پولھو رام نے اتنے اونچے سروں میں برہمانند کے بھجن گائے کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔ بہوویں بڑبڑانے لگیں، اور بچے رونے لگے۔ پاٹھ کے بعد پولھو رام سیر کے لیے نکلا۔ ایک دو گھنٹے تک تو وہ ریلوے گارڈن کی سڑکوں پر گھومتا رہا لیکن ریلوے گارڈن سے بڑا ڈاک خانہ ___ اس کا پرانا دفتر، دور نہیں تھا۔ پولھو رام کے قدم اسی طرف اٹھ گئے۔ اس کی حالت اس سانپ کی مانند تھی جو بہت عرصے کینچلی میں زندہ درگور رہ کر جب اپنی کینچلی کو اتار پھینکتا ہے تو بہت دور بھاگ جاتا ہے لیکن پھر ایک بار اسے دیکھنے کے لیے ضرور واپس آتا ہے اور سوچتا ہے ___ اس کمبخت نے مجھے سست بنا رکھا تھا، میری بینائی کمزور کر دی تھی، میں اچھی طرح سے چل بھی نہ سکتا تھا۔ اس کینچلی نے...... اس چھلی نے...... اس چمکتی ہوئی حقیر چھلی نے!

ڈاک خانے کے سامنے پہنچ کر پولھو رام کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے سامنے گاڑیاں

سرخ وردی پہنے قطار در قطار کھڑی تھیں، اور ان پر نیا پالش کیا ہوا "جی، آر، آئی" چمک رہا
تھا۔ چٹھیوں کے کمرے میں سارٹنگ پوسٹ مین ایک مشین کی سی سُرعت سے چٹھیاں ڈربوں
میں پھینک رہے ہوتے تھے۔ پولھو رام نے کہا انہی چٹھیوں نے تو مجھے بھگوان بھلا دیا تھا۔
یہیں مجھے دمہ کی شکایت شروع ہوئی تھی ...... آج میں ایک پرندے کی طرح
آزاد و بے نیاز ہوں۔ اسی دفتر میں مَیں صبح تاروں کی چھاؤں میں آتا اور رات تاروں
کی چھاؤں میں واپس جاتا تھا۔ درمیان میں دو ڈھائی گھنٹے کی چھٹی ہوتی لیکن وہ بھی
ایسی کہ نہ تو دفتر رہ سکوں اور نہ گھر جا سکوں۔ اگر گھر جاتا تو شام کی حاضری سے دیر ہو جاتی
اور اگر دفتر ہی رہتا تو بھوکوں مرتا۔ اسی لئے تو میں نے روٹی بھی دفتر ہی لے جانے
کا معمول بنا لیا تھا .... اور شام کے وقت جب کسی بابو کے حساب میں فرق
پڑتا تو رات کے دس گیارہ بج جاتے اور پولھو رام ان سب باتوں سے مانوس
ہو چکا تھا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کام ختم کرنے کے بعد بھی وہ دفتر کی میز پر ٹانگیں
دھرے بیٹھا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ دیر تک کام کرنے والے سے صاحب لوگ بہت
خوش رہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پرندے سارا دن شہر اور اس کے مضافات میں
دانہ دنکا چگنے کے بعد عقلِ حیوانی سے گھر کی جانب بے تحاشا کھچے جاتے ہوئے دکھائی
دیتے تھے لیکن پولھو رام نے اپنے تمام قدرتی احساسات کو غیر قدرتی ضرورتوں کے تابع
کر دیا تھا اور اس میں گھر جانے کی قدرتی حس مر چکی تھی۔ جب دفتر کے باقی بابو چلے جاتے
اور رتنا کروپ بتیاں بجھانے کے لئے ہال کے دوسرے سرے سے آتا ہوا دکھائی دیتا
تو پولھو رام کو محسوس ہوتا کہ وہاں اس کے پڑے رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور اب
اسے گھر جانے کے سوا چارہ ہی نہیں۔ اس وقت وہ اپنی لوہے کی چھڑی جس پر سے

تمام پالش اڑ چکا تھا تلاش کرتا اور گھر کی سمت چل دیتا اور دفتر سے گھر جانے کے بجائے ایسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی گھر سے دفتر جا رہا ہے۔

میل موٹروں کا اصطبل بہت پرانا ہو چکا تھا اور لمبی لمبی دراڑیں اصطبل سے ریکارڈ روم تک چلی گئی تھیں۔ پولو رام نے سوچا ابھی کل ہی تو اس نے مرمت کے سلسلے میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر کو جو تھا ریمائینڈر دیا تھا۔ شاید اس کا جواب آ چکا ہو۔ اس کے دل میں اس کیس کا جواب جاننے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن وہ ایک دو قدم چل کر رک گیا۔ اسے کیا؟ ...... بس کیا ہے تو خواہ ایک زلزلہ آ جائے اور سارے کا سارا ریکارڈ روم نیچے آ رہے اور سب ضروری اور غیر ضروری ریکارڈ خراب ہو جائے، وہ تو اب اس کینچلی کو اتار چکا تھا۔

پولو رام نے سوچا۔ کام کرنے والے کی قدر اس کے بعد ہوتی ہے۔ میں بارہ گھنٹے کی لگاتار نوکری دیتا تھا۔ اب محکمہ کو مجھ ایسا وفا شعار آدمی کہاں ملے گا؟ جب بھی کبھی صاحب آواز دیتا فوراً ہی میرا جواب آتا ــــ "جی حضور!" ...... اور صاحب مجھ سے کتنا خوش تھا۔ کہتا تھا "پولو رام کتنا پابند آدمی ہے۔ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے ــــ پابند۔ ہم نے بہت رات گئے اسے کام کرتے دیکھا۔ اس سے دفتر کی ایفی شنسی (EFFICIENCY) بڑھتا ہے ہم اس کی ایکسلری بڈ پروموشن کی سفارش کرے گا۔

پولو رام نے سوچا اب کام کرتے ہوں گے اور اپنی جان کو روتے ہوں گے۔ معاً پولو رام کو خیال آیا کہ جس شخص کو اس نے چارج دیا ہے وہ تو نرا گاؤدی ہے۔ سیکریٹیریٹ آفس کے دو کیس ہیں جنہیں میرے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اسے میری ضرورت کس شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہوگی۔ بڑے بڑے پولو رام اس کمرے کی طرف

ہولیا جہاں وہ ہر روز بیٹھا کرتا تھا۔

ڈائرکٹر کی میں پولھو رام کو اپنے قائم مقام کا سر نظر آنے لگا۔ وہ کاغذوں پر جھکا ہُوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی اُٹھا اور کسی ضرورت سے برآمدے کی طرف چلا آیا۔ پولھو رام نے بھاگ جانا چاہا لیکن وہ بھاگ نہ سکا۔

اچانک اس کے قائم مقام کی نظر پولھو رام پر پڑی اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہلو، پولھو رام جی ــــ کیا حال ہے آپ کا؟"

"اچھا ہے۔" پولھو رام نے جواب دیا۔

"کیسے تشریف لائے آپ؟"

"یونہی ــــ خط ڈالنے چلا آیا تھا۔"

اس کے بعد وہ بابو ہنسا اور قریب ہی کے ایک کمرے میں گم ہو گیا۔ اس نے فائلوں کے متعلق پولھو رام سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ پولھو رام سخت حیران تھا۔ "مجھے کیا؟ میرے لئے اب فائلیں خواہ برس بھر نہ جواب دیں۔ بڑی رہیں بچہ جی کو چارج شیٹ ملے گا۔ ترقی رک جائے گی پھر مزہ آئے گا۔"

پولھو رام کے پاؤں جو کہ سیر کی وجہ سے تھک گئے تھے، اب گھر کی طرف اُٹھنے لگے لیکن اسے پھر خیال آیا کہ کیا عجب جو بابو کو ان کاغذوں کے متعلق سمجھ کہ میں نے نچلی دراز میں "خفیہ" کا نشان دے کر رکھے تھے کچھ پتہ ہی نہ ہو یہی کہ اندر کچھ تیس برس ڈالی۔ اس نے اگر نہیں پوچھا تو میں ہی بتا دوں۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہ میری جان کو دعائیں دے گا۔ اور پولھو رام اپنے قائم مقام کی طنز آمیز مسکراہٹ کو بھول ہی گیا۔

جب ہمت کر کے پولھو رام نے اپنے قائم مقام کو کاغذوں کے متعلق تاکید کی تو اسے

پتہ چلا کہ اس نے تمام کاغذ دراز میں سے نکال لئے تھے اور ان کا مناسب جواب بھی دے چکا تھا۔ پولھو رام نے سوچا غلط سلط جواب دے دیا ہوگا اور پھر پولھو رام اپنے قائم مقام کے ہونے والے حشر پر آنسو بہاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی پولھو رام نے پھر اونچی آواز سے گانا شروع کر دیا اور ہر روز یہی ہوتا رہا۔ بچے پہلے تو ڈر کر اپنی ماؤں کی گودیوں میں چھپ جاتے۔ پھر اس قسم کی چیخ و پکار سے مانوس ہو گئے اور دادا کے ساتھ ہمنوا ہو کر محلہ کو سر پر اٹھانے لگے۔ بہوؤں کو بڑی دقت پیش آتی تھی۔ پہلے وہ گھر میں آزادانہ گھوما کرتی تھیں لیکن اب انہیں ایک لمبا سا گھونگھٹ نکالے اندر باہر جانا پڑتا تھا۔

اور پولھو رام جاتا بھی کہاں؟ گھر کے سوا اس کا ٹھکانہ بھی تو کہیں نہ تھا۔ اس کی شہر میں واقفیت تو تھی لیکن ایسی تو کسی کے ساتھ نہ تھی کہ اس کے پاس سارا دن ہی گزار دے۔ کبھی کبھی وہ گھر اودھے رام پالش فروش کی دکان پر جا بیٹھتا اور محلہ کی بد چلن عورتوں کی باتیں کیا کرتا اور کبھی کھانڈ کی دکان پر کھانڈ کا روز مرہ بدلنے والا بھاؤ پوچھنے چلا جاتا۔ پولھو رام کھانڈ کے نرخ میں اتار چڑھاؤ سے قومی بلکہ بین الاقوامی حالات کا اندازہ کر لیتا تھا۔ اس کے سوا اور اسے کوئی شغل نہ تھا۔ اس نے چھٹیوں اور منی آرڈروں کے سوا اور سیکھا بھی کیا تھا۔ اس روز مرہ کے شغل پر ایک ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا اور اگر کہیں اسے اخبار کا پرچہ مل جاتا تو زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی گھنٹے گزر جاتے۔ اس کے بعد گھر جانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا اور گھر پہنچتے ہی وہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا — یہ سلائی کی مشین بلا ضرورت بھلا یہاں کیوں پڑی ہے؟ اور یہ تیل کی

گیتی اور ابھی تک کسی نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ خدا جانے اس گھر میں چار عورتیں کرتی کیا رہتی ہیں اور ان بچوں کا رونا مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا ..... غرضیکہ پولھو رام اتنا چڑچڑا ثابت ہو رہا تھا کہ بہوئیں تو ایک طرف خود سیتا بھی اسے محسوس کرنے لگی تھی۔

ایک دن پولھو رام دن بھر لڑتا جھگڑتا رہا اور سب کا خیال تھا کہ آج گالی گلوچ، مار پیٹ ہو کر رہے گی لیکن شام کے قریب نوبت رائے پولھو رام کا بڑا لڑکا آیا تو پولھو رام نے پوچھا۔ ”دہ پچیس روپے کا منی آرڈر کروا دیا تم نے؟“

”کروا دیا پتا جی۔“ نوبت بولا

”کیا فیس دی؟“

”چھ آنے۔“

”ہیں!“ پولھو رام نے ایک دفعہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر بے تحاشہ ہنسنے لگا ”ارے نوبت! کتنا بھولا ہے تو، یہ بھی نہیں جانتا پچیس روپے کی چونی کمیشن لگے۔ یہ تو بازار کا ایک گنوار بھی جانتا ہے، اور تو جو پولھو رام ریٹائرڈ اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر کا لڑکا ہے، تجھے اتنا بھی نا معلوم کہ پچیس پر چونی فیس دی جاتی ہے .... ہے ہا ..... واہ رے واہ ...... ہا ہا ......“

اور پولھو رام کبھی خفا ہوتا اور کبھی ہنسنے لگتا۔ چھوٹی بہو بھی ہنسی میں شریک ہو گئی۔ بولی ”میرا جیٹھ تو سچ مچ بھولا مہیش ہے۔ دونی مفت میں زیادہ دے آیا! اور اب وہی بھرے دونی۔ ہاں بھئی! ہم یہ دونی سا تجھے کھانے میں نہ لگنے دیں گے ...... دونی کا نمک ہی آ جاتا ہے۔ سارا مہینہ چل جاتا ہے دونی کا نمک۔“

چھوٹی بہو بڑے گھر کی لڑکی تھی نا۔ وہی پولھو رام کے ساتھ ہر بات میں متفق ہوتی

تھی۔ دونوں امیر اور فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ پولھو رام نے کہا۔"۔۔۔۔ ہاہا ۔۔۔۔۔ پچیس پر چپڑاسی نے نہیں دے آیا ۔۔۔۔۔ ای ہی کھی کھی ۔۔۔۔۔۔۔ اور نوبت بھی ساتھ مل کر ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

پلٹتے ہوئے پولھو رام نے پوچھا "کون تھا بابو؟"

نوبت رائے نے بڑے لمبے چوڑے طریقے سے بابو کی شکل بیان کی ــــ وہ موٹا تھا۔۔۔۔ لیکن موٹے تو سب ہی بابو ہوتے ہیں ـــــ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ ــــــ پولھو رام بولا۔" نتھنے تو کئی بابوؤں کے پھولے ہوئے ہیں" اس کی آنکھیں بے تحاشا تمباکو پینے سے بہت میلی ہو چکی ہیں لیکن آنکھیں تو درجنوں بابوؤں کی میلی ہیں اور آج کل تو ہر ایک بابو بے تحاشا تمباکو پیتا ہے۔ آخر تنگی سے سمجھ میں آیا کہ بابو روپ کشن نے ہی دونی زیادہ لی ہوگی۔ رسید پر بھی تو اسی کے دستخط دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہے ہی پاجی، بڑا کمینہ آدمی ہے، عیاش ہے، فاسق ہے۔ ایک عورت بن بیاہی ڈال رکھی ہے۔ وہ ایسی باتیں نہ کرے تو گزر کیسے ہو اور آخر تاں یہاں ٹوٹی۔"ارے! تو اتنے بڑے پوسٹ ماسٹر کا لڑکا ہو کر دونی زیادہ دے آیا۔۔۔؟"

نوبت اور اس کی بیوی ہنستی شرم سے گردن جھکائے رسوئی میں دبکے رہے۔

نوبت اپنے گھٹنوں میں سر دیئے کچھ سوچتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رو دے۔ لیکن وہ اپنی چھوٹی بھاوجوں کے سامنے نہیں روئے گا۔ جب وہ سونے کے لیے جائے گا تو اپنی بیوی کی گود میں سر رکھ کر بے تحاشہ روئے گا اور خوب ہی دل کا بخار نکالے گا۔ اس وقت تو وہ چولہے کے پاس بیٹھا ہوا ایندھن کے چھوٹے چھوٹے تنکے اٹھا اٹھا کر چولہے میں پھینکتا رہا۔

شام کے قریب دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی۔ پولھو رام نے سر باہر نکال کر دیکھا —— اس کا قائم مقام تھا۔ پولھو رام کا دل خوشی سے اچھلنے لگا، وہ اسے کچھ کہے بغیر ہی الٹے پاؤں اندر بھاگ آیا۔ سمدھ سے لانے اور چائے بنانے کا حکم دے کر خود بیٹھک میں چلا گیا، اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنے قائم مقام کو اندر بٹھایا۔ اس شخص کو کسی کیس میں پولھو رام سے مشورہ لینا تھا۔ پولھو رام نے فوراً الماری میں سے پرانی والیوم نکالی اور اس خاص موضوع پر تمام رول اس کے سامنے رکھ دیئے اور پھر وعدہ کیا کہ وہ تمام رات بیٹھ کر ان نکتوں کے مطابق ڈرافٹ تیار کرے گا۔ پھر اس نے بابو روپ کشن کی شکایت کی اور اس کا قائم مقام رخصت ہوا۔

اندر آتے ہی پولھو رام بولا۔ "وہ سب کہتے ہیں میرے بغیر دفتر چوپٹ ہو رہا ہے۔ یہ بابو بھی میری طرح اڑھائی سو تنخواہ پاتا تھا —— ہے، اور مجھ سے مشورے کے لئے اتنی دور سے چلا آیا ہے۔ ایک دن کوئی آدمی ملتان سے میری شہرت سن کر آیا تھا۔ صاحب کہتا تھا مجھے پولھو رام پر ناز ہے اور یہ ہے میرا بیٹا جس نے میرے نام کو لاج لگا دی۔"

اور ریٹائر ہونے کے اس چھ ماہ کے عرصے میں آج شاید پہلا دن تھا جبکہ پولھو رام مسرور نظر آتا تھا۔ آخر اس کا قائم مقام اتنی دور سے مشورہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔ پولھو رام سارا دن گاتا رہا —— کچھ تا گئے ہیں کبھی آئے گی سرکار مری —— اور اسے خوش دیکھ کر چھوٹی بہو نے اپنے بچے کو پتا جی کی گود میں دھکیل دیا۔ پتا جی بولے: چھوٹی بہو کتنی اچھی ہے، دیکھو اسے سارے گھر کے لئے دوتی کے نمک کا خیال آیا اور تو گنتی، تو بڑی خراب ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی

نہیں، اور شانو ——— شانو ہے بھی تو بہت پیاری۔ بس اسے دیکھتا جائے آدمی ..
..... دیکھو کیسے آنکھیں موند لیتی ہے .... ہائے ..... چھی .....
میں اسے لا دوں گا ایک ملائم سی گڑیا اور سیتو اکل ہی سنے سیف میں دو دھیلے بھی
رکھے تھے لانا ذرا وہ۔ ایک منے کو دوں گا اور ایک ننھی کو۔" اور چھوٹی بہو مسرت کے
احساس سے بولی "پتا جی! آپ نے مجھ سے رس گلوں کا وعدہ کیا ہے۔"

پولھو رام بولے "میں جانتا ہوں تو بہت شوقین ہے رس گلوں کی۔ میں ایک ..
... دو ...... تین روپے کے رس گلے لاؤں گا اور بڑی بہو کے لئے مالا لا دوں گا
اور گنگلی کوئی دوسری ہے وہ بھی تو اپنی ہی بیٹی ہے نا۔ ایسے ہی جیسے دمینتی میری بیٹی ہے۔"

دمینتی، بڑی بہو اپنے شوہر کی دوڑی کو بھی بھول گئی اور دل میں سوچنے لگی۔ پتا جی بھی
ایسے برُے کیا ہیں۔ مارتے ہیں تو پیار بھی تو کرتے ہیں، اور نوبت رائے اپنی بیوی کے
اس انحراف پر دل ہی دل میں اسے کوسنے لگا۔ پولھو رام نے سب سے رس گلوں کا
وعدہ کر لیا اور چھوٹی بہو سب کچھ سمجھتی تھی اور کہتی تھی۔ بس رس گلے ہی تو آ جائیں گے۔
کنگن بھی آ گئے، پریاگ بھی ہو آئے۔ نوبت کی ماں سمیت .... اور فقط
رس گلوں کی کسر ہے ———

پولھو رام نے تمام رات جاگ کر ڈرافٹ تیار کیا اور صبح جب وہ دفتر میں پُرخلوص
انداز سے داخل ہوا تو اس کے قائم مقام کے سوا اور کسی نے اس کی پروا نہ کی۔ صاحب
بھی تینوں مرتبہ اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر گزر گیا۔ کھگو خاکروب نے بھی اسے
قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ پولھو رام نے بابو روپ کشن سے دونی مانگی مگر وہ صاف مکر گیا۔

گرمن

پولھو رام نے سوچا شاید نوبت نے وہ دونی منیتی کو کچھ لا دینے کے لئے اڑا لی ہو گی۔ ضرورت تھی تو اگر صاف صاف مانگ لیتا۔ یہ اچک لینے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ خیر، گھر چل کر اس سے پوچھا جائے گا . . . گھر پہنچا تو نوبت موجود نہ تھا۔ پولھو رام اونچے اونچے برہمانند کے بھجن پڑھنے کے بعد گھر کی عورتوں پر برسنے لگا اور ان سب کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ خود بھی تو پولھو رام اس زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ یکم کی صبح کو جب وہ پنشن لینے گیا تو حسبِ دستور نوٹس بورڈ پڑھنے لگا —— ڈاک خانے کو شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں ایک اکسٹرا ڈیپارٹمنٹل ڈاک خانے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے پچیس روپے مع کرایہ مکان اور اسٹیشنری ملتے تھے۔

اس وقت اپنے قائم مقام کی مدد کام آئی اور پولھو رام نے وہ پچیس روپے کی نوکری کر لی۔ اب وہ صبح آٹھ بجے ہی نکل جاتا تھا اور رات کو دیر سے گھر آتا۔ کام کی کثرت سے اس کا دمہ جو کہ معمولی حالت میں تھا۔ خوفناک صورت اختیار کر گیا۔ بسا اوقات منی آرڈر بک کرتے ہوئے اسے دورہ پڑتا تو پیسے، بیمے، رسیدیں سب میز پر بکھر جاتیں۔ اس کا منہ سرخ ہو جاتا۔ آنکھیں پتھرا جاتیں اور منہ میں سے کف کے چھینٹے اڑ کر کھڑکی میں سے داخل ہونے والی روشنی کی کرن میں ایک ہیبتناک قوسِ قزح کا رنگ بھرتے، منہ، ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ اور اسی حالت میں پولھو رام کھڑکی کے قریب فرش پر لوٹنے لگتا۔ پبلک کے آدمی کونٹر پہ بکھرے ہوئے پیسوں کو اس کے لئے سمیٹتے اور بڑے رحم کی نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھتے اور کہتے "ڈاک خانہ کیوں نہیں اس غریب بوڑھے کو پنشن دے دیتا؟"

ہڈیاں اور پھول

آٹھ، نو مہینے کے متواتر استعمال سے میرے بوٹوں کے تلے گھس گئے تھے اور ان میں دو ایک ایسے چھوٹے چھوٹے سوراخ پیدا ہو گئے جن میں سے کیچڑ داخل ہو کر انہیں گیلا کرنے کے علاوہ میری طبیعت کی عیاشی کے ثبوت یعنی ریشمی جرابوں کو خراب کر دیا کرتا۔ ایک قسم کی لجلجاہٹ کی کیفیت میں میرے حواسِ خمسہ اپنے پاؤں اور ان میں لتھڑے ہوئے کیچڑ میں سمٹ آتے۔ میرے دماغ میں کوئی نازک خیال جگہ ہی نہ پاسکتا گویا میرا دماغ ایک ناقابلِ گزر دلدل بن گیا ہو۔

اس وقت میں ڈرتا ڈرتا اُلم کے پاس گیا۔ اُلم، جیسا کہ میں اسے بطور ایک پڑوسی کے جانتا تھا، ایک تنہائی پسند غصیلا موچی تھا۔ وہ کئی بار اپنی بیوی کو پیٹا کرتا۔ شاید اسی لئے وہ بیزار ہو کر بچوں سمیت میکے بھاگ گئی تھی اور وہاں سے اس نے آج تک

رسید کا خط بھی نہ بھیجا تھا . . . بلم کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی ۔ جس میں دو تین کاریگر ایک مٹی کے تیل کے پرانے لیمپ کے نیچے پتنگوں اور پروانوں کی بارش کے باوجود بہت رات گئے تک بیٹھے کام کیا کرتے تھے اور مجھے اپنے چوبارے پر سے فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے نظر آیا کرتے۔

بلم کے علاوہ اس وسیع کالی باڑی میں کوئی اور موچی تھا بھی نہیں اور بلم بھی عام موچیوں کی طرح کالی باڑی میں سے گزرنے والے ہر راہرو کے پاؤں کی طرف دیکھا کرتا اور بوٹ کی پالش کے حساب سے بوٹ والے کی مالی حیثیت کا اندازہ لگاتا۔ حالانکہ وہ عام موچیوں کی طرح ناسمجھ آدمی تھا اور جہاں تک مجھے علم تھا وہ کچھ لکھ پڑھ بھی لیتا تھا ۔ اس کے باوجود اسے بھی بوٹ ہاتھ میں لیتے ہی جس کے قریب مرمت طلب جگہوں کی طرف اشارہ کرنے کی عادت تھی ——— یہاں سلائی ہوگی۔ یہاں بھی سلائی ہوگی ۔ اس جگہ پیوند لگیں گے اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد ایڑیوں میں لپا لگے گا اور اس لپا کے لفظ سے مجھے بہت چڑ تھی۔

کالی باڑی کے بازار میں ڈوبگرو نسل کے سب کتے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کی دم سونگھ رہے تھے اور بلم اپنی آنکھ کو ایک کھردرے خالص چمڑے میں دیئے نہایت دلچسپی سے ان آوارہ کتوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ میں نے اس سے ایک آزادانہ لہجے میں صرف اسی نئے کام کیا کہ شاید وہ اس طرح مزدوری کم طلب کرے گا اور کیا معلوم جو وہ پیسے کا ذکر ہی نہ کرے ۔

"ان کتوں کا آپس میں متعارف ہونے کا ڈھنگ بھی عجیب ہے!" میں نے ضرورت سے زیادہ ہنستے ہوئے کہا۔

گرمن

تم نے بھی اپنے دانت دکھا دیئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ گویا وہ کاروباری طور پر مجھ سے افضل ہے اور میری اس رمز کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ صندوقچی میں سے کیل، ستلی اور موم تلاش کرنے لگا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا اور کاریگر روٹی کھانے کے لئے کہیں گئے ہوئے تھے۔ پرانے اور خام چمڑے کے سینکڑوں ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ تم نے آر اٹھائی، اسے پتھر پر رگڑا اور میرے بوٹوں کی سلائی شروع کر دی۔

تم کی خاموشی کی وجہ سے میں سلسلہ گفتگو دراز نہ کر سکا۔ کچھ دیر بعد اپنی روئی دار بنڈی کے سوتی بٹن بند کرتے ہوئے وہ خود ہی بولا۔

"ان کتوں کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کی بات یاد آ گئی بابو جی۔"

میں تجسس کی وجہ سے خود ہی تم کی بھائی ہجوتی بیدی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن جب تم نے ہی وہ سلسلہ چھیڑا تو میں نے رسمی طور پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"کتوں سے؟ —— گھر کی بات؟"

تم کچھ جھینپ سا گیا اور دوسرے بوٹ کے لئے تلا تلاش کرنے کو صندوقچی پر ضرورت سے زیادہ جھک گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا۔ جیسے میں اس کی بات بہت دلچسپی سے نہیں سن رہا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ بے تکلفی سے اپنے من کی بات کہہ دے گا۔ چنانچہ اس نے ستلی پر موم رگڑنے سے پہلے اچٹتا سا ایک بار میری طرف دیکھا۔ اور مجھے اپنی دیا سلائی اور سگریٹ میں نیم متوجہ پا کر بولا۔

"انہیں کتوں کو دیکھ کر گوری نے ایسی بات کی جو آج تک مجھے ستاتی

ہے۔ یوں اس سے عموماً ہلا گنا ہی رہتا تھا۔ اسے ذرا ذرا سی بات پر پیٹا کرتا اور کہتا: ہڈیاں توڑ دوں گا تیری۔ حالانکہ وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچ ہی تو رہ گئی تھی اور اس کے منہ پر سرسوں کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس دن بھی ڈونگر محلہ کے سب کتے کالی باڑی کے اس بازار میں چلے آئے تھے اور ایک بڑا سا کتا ایک کھجلی ماری کتیا کے سامنے اپنی دم ہلا رہا تھا جیسے بڑا پیار جتا رہا ہو اور گوری تو جانے کا گ بھاشا ہی سمجھتی تھی۔ وہ یہاں، اسی جگہ، اسی دہلیز، اسی دروازے کا سہارا لئے کھڑی مسکراتی رہی۔ پھر سامنے کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"دیکھو تو وہ کیسے دم ہلا رہا ہے"

اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک تنومند کتا بھی کتیا کے بدصورت ہو جانے پر اس کی محبت کا دم بھرے جاتا ہے تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے؟ تم بجو ایک شرابی اور بدصورت آدمی ہو۔ روگ تو جی کا ساتھ لگا ہی ہوا ہے اور پہلے ہی کتنی تندرست ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ کتا غرانے لگا اور اپنے اگلے پنجوں سے مٹی کرید کر پیچھے کی جانب پھینکنے لگا۔ شاید وہ اپنے رقیبوں کو مقابلے کے لئے اکساتا تھا لیکن میں نے گوری سے کہا "دیکھو تو وہ کتنی نفرت کا اظہار کر رہا ہے —— اسے بھی یہ کھجلی ماری، مریل مادہ پسند نہیں"

اس کے بعد وہ چپ ہو گئی۔ پھر جیسے کہ اس کی عادت تھی، سامنے چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس چارپائی پر جس کے نیچے شراب کے خالی پوتے اور ادھیڑے اور ان کے چھوٹے چھوٹے کترے ہوئے یا ادھ ٹوٹے کاگ پڑے ہیں۔ وہ ایک گیت

گنگنانے لگی۔ جس میں ایک آدمی اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تُو تو میرے نئے بلائے جان ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ تو مر جا، مجھے رنڈوا ہونے کا بڑا شوق ہے۔ بابوجی! اس گیت کا مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔ میں اس وقت گا کر نہیں سنا سکتا اور مجھے ابھی دوسرا تلا بھی لگانا ہے ——— اور ہاں شاید آپ کو بھی ڈاک خانے جانا ہو گا۔

میں نے بوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ خاموش طبیعت موچی آج کتنا باتونی ہو گیا ہے۔ اور باتونی مزدور کام اچھا نہیں کرتے۔ پھر بھی میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تو تلم ——— مجھے آج چھٹی ہے۔''

تلم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ آدمی کہتا ہے۔ تو اپنے میکے جا کر مرنا۔ پھر میں وہاں تیرے پھول چننے، اور تیری موت پر افسوس کرنے کے لئے آؤں گا۔ وہ جواب دیتی ہے تم ہرگز ہرگز وہاں نہ آنا۔ میں مر گئی ——— ماں باپ کی چندن کی شہتیری بہ گئی۔ تمہارا کیا گیا اور اس کے بعد قضا کار وہ مر جاتی ہے۔ تو وہ اس کی سمادھ پر جا کر کہتا ہے ———

گوری! ایک دفعہ تو بول، دیکھ میں کتنی دھوپ میں، کتنی دور سے پاپیادہ تیری سمادھ پر آیا ہوں۔ جنڈ کی چتکبری چھاؤں موت کی آواز بن کر کہتی ہے میں مرے ہوئے سے انسان کا سا عارضی پیار نہیں کرتی۔ تلم کہتا ہے گوری ایک دفعہ تو جی لے۔ میں نے رنڈوے ہو کر بہت دکھ پایا ہے۔

اس کے بعد تلم نے میرے جوتوں کی سلائی چھوڑ دی۔ اپنی پگڑی سے پتو اتارا اور اس سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔ جذبات کی رو میں میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئی تھیں۔ اس وقت میں گیت کی افسانوی قیمت پر غور کر رہا تھا تلم نے ایک ایسی

بات بتائی ہے انسانی فطرت پر ایک طنز تھی - وہ یہ کہ جب اس کی بیوی دلہن بن کر آئی تو تھمن اس کی جوانی اور خوبصورتی کی بے طرح پاسبانی کرنے لگا - وہ اسے دروازے میں بھی کھڑی دیکھتا تو بیلنے لگتا - یہ شک و شبہ کی عادت ابھی تک باقی تھی - اس وقت جبکہ گوری کا جسم توانا اور بھرا ہوا تھا وہ اسے کہتا رہا - مجھے ایک پتلی نازک عورت پسند ہے اور جب وہ دبلی ہو گئی تو کہنے لگا - مجھے تم سی مریل عورتوں سے سخت نفرت ہے - یہ ان ہی دنوں کی بات تھی جب وہ کتوں والا واقعہ پیش آیا تھا -

سوچی کی ان سب باتوں سے میں نے یہی اخذ کیا کہ گوری آخر میکے جا کر مر گئی ہو گی - آخر تھمن کے اتنا جذباتی ہو جانے کا کیا سبب ؟ اس وقت مجھے وہ کہانی نامکمل سی دکھائی دی اور میں نے چونکتے ہوئے کہا "پھر اس کے بعد کیا ہوا ——— ؟ تم نے بات تو ختم ہی نہیں کی"

تھمن بولا "اس تین چار ماہ کے عرصے میں ادھر سے کوئی خط نہیں آیا - وہ پہلے ہی سے بیمار تھی، مر گئی ہو گی - سلطان پور یہاں سے تین چار سو کوس دور پورب دیس میں ہے - اتنا خرچ ڈاک خانہ لگتا ہے - میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں ؟ میرے پاس کرایہ تک نہیں ہے - میرے غصیلے پن سے سبھی نالاں ہیں - کوئی مجھے مانگے کی ایک کوڑی بھی تو نہیں دیتے - یہاں شراب کی کچھ بوتلیں پڑی ہیں اور بس - بابو جی! میری خواہش ہے - میں ایک دفعہ وہاں افسوس کرنے کے لئے تو چلا جاؤں !"

لیکن تھمن کا وہ خیال خام تھا - اس چرچرے کی طرح خام جو اس نے باتوں باتوں میں میرے بوٹ کے نیچے رکھ دیا تھا اور جو ایک ہی مہینے میں گھس گیا - اس ایک مہینے

کے اندر تلم ایک دن میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ میں اس وقت چوبارے کے چھجے پر بیٹھا، کاٹھ کے جنگلے پر ٹانگیں لٹکائے، پڑھنے کی بجائے کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ تلم نے ایک ہاتھ اونچا کیا۔

"خط ہے ——— بابو جی ایک خط ہے" وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے چوبارے پر سے اُتر کر خط پڑھا سلطان پور سے آیا تھا تلم کو ایک دو لفظوں کی سمجھ نہ آتی تھی۔ اس خط میں گوری کے متعلق لکھا تھا۔ وہ خفیف چھاچھ کے استعمال سے تندرست ہو گئی تھی۔ اور چترتی کے بعد واپس آ رہی تھی گنیش چترتی کا چاند دیکھنے سے کوئی الزام لگ جاتا ہے۔ خود کرشن مہاراج جنہوں نے کسی جانور کے کھر سے بنے ہوئے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی کے اندر چاند کا عکس دیکھ لیا تھا، تہمت سے نہ بچے۔ اس چترتی کو گزار کر آنا ضروری تھا۔

خدا ایسے ہر آدمی کو کام دے! میں ان دنوں اپنے چوبارے میں بیٹھا تلم کی فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے تلم کی سب حرکات دیکھا کرتا۔ جب اس کے ساتھ کام کرنے والے کاریگر چلے جاتے تو تلم ایک کھونٹی پر لٹکے ہوئے چیلے کو اتار لیتا۔ اور بڑے اچنبھے اور وحشیانہ انداز سے اسے پیار کرنے لگتا۔ جیسے کوئی ننھی منی سی لڑکی گڑیا سے کھیل رہی ہو اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر اس بے جان گڑیا سے ہزاروں بے معنی باتیں کر لیتی ہو۔ چیلے کے علاوہ گوری کوئی میلا کچیلا دوپٹہ الگنی پر بھول گئی تھی۔ تلم اسے اتار کر اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچنے لگتا، بیدی، اور اس کے بعد اس کا چیلا، اور پھر دوپٹہ، اور چند ایسے تلم کی محدود کائنات تھی غصیلا اور نڑاکا ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔ گوری نے میکے جا کر ایسے

گرہن

خوب ہی سزا دی اور اپنی بیماری کا کیا سہل علاج دریافت کر لیا۔ بچا چھدّ!
میں سوچنے لگا۔ اب تمّو نے گوری کی قدر پہچانی ہوگی۔ اور جب وہ چیترتی کے بعد واپس آجائے گی۔ تو وہ اس کی پوجا کیا کرے گا۔ اس وقت دھوپ کی معتدل حرارت میں مجھے کچھ نیند سی آنے لگی اور میں گوری کے گیت کے متعلق سوچتا ہوا اونگھنے لگا۔ اس وقت ایک خیال میرے دماغ میں آیا ——— جیتے جی انسان کی ہڈیاں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد پھول ہو جاتے ہیں۔

چیترتی کے تیسرے روز تمّو کی بیوی کو آنا تھا۔ اس دن تمّو نے فیکٹری کے تمام مزدوروں کو چھٹی دے کر اپنے احمقانہ پن اور جلد بازی کا ثبوت دیا۔ وہ خود تمام دن گاڑی کے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ اس دن تمّو نے روز کے نشے میں سے آدھ سیر جلیبیوں کی گنجائش نکالی اور ایک آب خورے میں آدھ سیر دودھ لا کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور بلی کے ڈر سے موری کے منہ پر چھوٹی چھوٹی اینٹیں لگا دیں۔

گذشتہ دنوں میں، ڈوگر محلہ کے چھوکروں اور کالی باڑی کے چھیر چھبیلوں، اکڑ چھیلوں اور باسووں کے لڑکوں کی گلیاں اور گیند ٹوٹے ہوئے روشن دان سے تمّو کی فیکٹری میں جا پڑے تھے۔ چھوکروں نے ڈر سے انہیں مانگنے کی جرأت ہی نہ کی تھی۔ اکیلا تمّو ہی اپنی گوری کے آنے کا منتظر نہیں تھا۔ وہ بچے بھی اس کا انتظار کر رہے تھے اور آج تمّو کے گھر کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ کب وہ آئے گی اور گلی دے گی۔ پڑوس کے نابینا استاد کی لڑکی ثریا کئی دفعہ پوچھ چکی تھی "خالہ کب آئے گی؟" گوری کا پڑوس کی سب عورتوں سے میل جول تھا۔ وہ ثریا کا سر دیکھ دیا کرتی تھی جس میں بارہا لیکھیں

پڑ گئی تھیں۔ فیکٹری کی پشت کی جانب جوالا پرشاد کا گھر تھا۔ وہ ایک بار ایک دن کے نوٹس پر تبدیل ہوا تھا تو تلم کی بیوی نے ایک دن میں اس کے تین درجن کے قریب کپڑے دھو ڈالے تھے۔ یہ سب کے سب چرتی سے تیسرے روز کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ بار بار گوری کے متعلق پوچھتے تو تلم کو اپنی نامقبولیت کے مقابلے پر گوری کی مقبولیت کا احساس ہوتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا۔ شاید یہ سب کچھ گوری کی خوب صورتی کی وجہ سے ہوگا۔ عورتیں بھی تو عورتوں پر عاشق ہو جاتی ہیں، اس کی سہیلیاں بن جاتی ہیں اور اس کے ارد گرد منڈلاتی ہیں۔ پھر اس میں حسد و رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور جب کبھی کوئی نوجوان پڑوسی اس کے گھر کے متعلق بات کرتا تو تلم نہایت شک وشبہ کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا۔ اسی لئے میں نے گوری کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کو یادداشت سے احتیاطاً خارج کر دیا تھا۔ حالانکہ مجھے بھی خواہش تھی کہ میرے چوبارے کے سامنے تھوڑی سی رونق ہو جاتے اور اس سونی فیکٹری کے اندر سے ایک پتلی سی خوب صورت آواز آیا کرے۔ ایک دم سے پھول سا چہرہ دکھائی دے اور چھپ جائے۔ گوری کے چلے جانے کے بعد مدت تک میں اس خلا کو محسوس کرتا رہا تھا۔ اس حالت میں یہ کمی تلم کو کیسے نہ اکھرتی ہوگی۔ تلم کو جس کی گوری اپنی ملکیت تھی اور جسے اس پر بجا غرور تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر آج۔ شاید پہلی دفعہ تلم میں ہر چیز اپنی چھوڑ دینے اور ہر کسی سے میل ملاپ رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بچوں کی گلیاں اور گیند اٹھائے اور میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دے دیئے۔ پھر اس نے ثریا کو بلایا۔ اس کے ساتھ دو تین اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی تھیں۔ تلم نے جیب میں سے اکنی نکالی اور اسے ثریا کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے بولا:

"———— یہ خرچ کر لو، لیکن دیکھو بیٹا! ———— نیل کی چیز مت کھانا۔"

اس "نیل کی چیز مت کھانا" میں زندگی، اچھی زندگی اور اس کی متعلقہ رجائیت سے ایک غیر مشروط صلح کا جذبہ ظاہر تھا۔ اس دن تم اسٹیشن پر بیوی کو لینے گیا اور جب شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی۔ وہ یوں ہی مغموم اداس واپس چلا آ رہا تھا۔ سلطان پور سے آنے والی گاڑی میں اس کی بیوی نہیں آئی تھی۔

اس دن تم نے بچے ہوئے پیسوں سے شراب منگوائی اور خوب پی اور پگڑی کے کھلتے ہوتے پیچوں کو لپیٹ لپیٹ کر گندی گندی گالیاں دیتا رہا۔ شام کے قریب اس نے دوپٹے کو اتارا۔ اور اسے آنکھوں سے لگا کر رونے لگا۔ پھر خود بخود اس کی ڈھارس سی بندھی اس کے باوجود کہ وہ نشے میں تھا اور وہ دیوانے کتے کی طرح منہ میں کف پیدا کیے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومنے لگا۔ کبھی کبھی چھلّے کو اتار کر چوم بھی لیتا مجھے ان روشندانوں میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے ساتھ رہنے والے یٰسین کو بھی تم کی حرکات دکھائیں۔

رات کے نو ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ میں اور یٰسین تختے پر کھڑے تم کو دیکھ رہے تھے۔ مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں تم نے ہمارے دیکھتے دیکھتے سب کپڑے اتار دیئے اور ننگا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہیں سے اپنی بیوی کی سرخ صدری برآمد کی۔ اور اس چارپائی پر جس کے نیچے شراب کی خالی بوتلیں اور ڈھکنے پڑے رہتے تھے، وہ اکیلی صدری پہن کر سو گیا۔

اس کے بعد ایک اور خط آیا جس میں تم کی بیوی نے اپنے نہ پہنچنے کی وجہ

بتائی تھی کہیں جیٹ تی کے روز بھولے سے اس وہمی عورت کی نظر چاند پر پڑ گئی تھی۔ اور اب وہ اُپائے کروا رہی تھی۔

خط میں اور باتوں کے علاوہ سنتان پور سے واپسی کی مقررہ تاریخ بھی لکھی تھی۔ اس دن حسبِ دستور ثریا اور دوسرے بچے پوچھنے کے لئے آئے اور ہم نے قصداً اس بات کا تذکرہ نہ کیا۔ اس دن مغل پور کے اسٹیشن پر سے کسی لیڈر کو گزرنا تھا۔ اس لئے میں اور نسیم نے بھی سٹیشن جانے کا ارادہ کر لیا۔

تلمہ نے اس دن بھی حسبِ معمول فیکٹری کے کاریگروں کو چھٹی دے دی اور آب خورے میں دودھ منگوا رکھا۔ کاریگر بھی تلمہ کے اس اضطراب اور اس کی بیوی کے آنے پر نہ آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنستے تھے اور ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے۔

شام کے جھٹ پٹے میں تلمہ سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ سٹیشن قصبے سے پون میل کے قریب تھا اور ابھی اتنی روشنی تھی کہ راستے میں شاہ جی کے باغ کے سنگترے اور ان کا نارنجی رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ تین چار آوارہ جانور باڑھ کو توڑ کر باغ کے اندر داخل ہو رہے تھے اور ہمارے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر تلمہ سرِ راہ سنگریزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ اس نے سر پر ایک سرخ بنارسی صافہ باندھ رکھا تھا کبھی تلمہ گرد و غبار میں ہماری نظروں سے غائب ہو جاتا اور کبھی پھر اس کا بنارسی صافہ دھندلکے کو چیرتا ہوا ہماری نظروں میں کھبنے لگتا۔

اس دن سٹیشن پر بھیڑ تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد گاڑی آئی۔ اس کے وسط میں ایک زنانہ ڈبہ تھا اور عورتوں کے ہجوم میں دو متجسس سہمی ہوئی آنکھیں فکرمندی

کے احساس سے پلیٹ فارم پر گھومنے والے خوب صورت سے خوب صورت، متمول سے متمول آدمیوں کے گروہ میں ایک بدصورت، قلاش اور چڑچڑے آدمی کی جورو بیاں تھیں۔

رتم آہستہ آہستہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا گوری کی صحت پہلے کی نسبت بہت اچھی ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ شگفتہ پھول کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ لمبے سفر کی وجہ سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھیں چار ہونے پر وہ بے صبری کی کیفیت نہ رہی یا شاید وہ اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

رتم نے وہ ایک میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھڑیاں، اُگنوں کی ایک پوٹلی اور چند اور چیزیں اتاریں اور اس کے بعد گوری بھی نیچے اتر آئی۔

چلتے چلتے بھیڑ میں گوری کسی کے ساتھ ٹکرا گئی۔ رتم نے اس واقعے کو دیکھا۔ اس کے علاوہ پل کی سیڑھیوں پر چند ایک بے کار نوجوان کھڑے گوری کو دیکھ رہے تھے۔ جو ایک خاص قسم کی کیفیت میں اٹھی سی چلی جارہی تھی۔ رتم نے غصے سے پیچھے دیکھا اور بولا:

"گوری ——"

گوری نے کانپ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور گھونگٹ سر پر ڈال لیا۔

اب اسے راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ رتم کے دھوکے میں اس نے اپنا ہاتھ کسی اور شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ یا شاید بیتری کے چاند دیکھ لینے کی وجہ سے تھا کہ رتم نے غصے سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ نئے ڈھنگ سیکھ آئی ہو ———— پھر آ گئیں"

میری جان کو دکھ دینے ۔"

. . . . اُس وقت پل کے پاس، ایک مریل سا کتا ایک خوب صورت کتیا کے سامنے اظہار محبت میں دم ہلا رہا تھا!

زین العابدین

اونگھ جانے کے عرصہ بعد تک سگریٹ کا وہ ٹکڑا میری انگلیوں میں سلگتا رہا تھا،
جلا گیا...... جلا گیا......

اونگھنے کے عمل میں جو لذت کا پہلو ہوتا ہے میں اس سے اچھی طرح لطف اندوز
ہونا چاہتا تھا۔ بیداری کی تلخ حقیقتوں کو کس طرح انسان خواب کے حسین لمحات میں
کھوئے دیتا جاتا ہے...... ایک دم سگریٹ کے ٹکڑے نے مجھے دو انگلیوں کے
درمیان کاٹا میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا سگریٹ کا ٹکڑا ایک شعلہ بن کر فرش پر گر کر
سلگنے لگا۔ اسے پاؤں سے خاموش کرتے ہوئے میں نے میز پر رکھی چائے کی پیالی کو ہاتھ
سے چھوا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور [illegible] کا خوبصورت ایرانی برتن دھواں دھواں سا
اور [illegible] ہوتے کو دیکھنے [illegible] پاس پڑے [illegible] ایک [illegible] کرتے [illegible]

گرہن

سوتے سوتے وہ سو ہی گئے تھے۔

سرد خون والے جانور، مثلاً سکھوں کے عہد حکومت کی بنی ہوئی ہماری کوٹھڑی کی ٹوٹی پھوٹی چھت کے پیچھے بسنے والے اسفنجی کیڑے، ہزار پا، چھپکلیاں اور ان کے رینگنے والے بھائی منجمد ہو چکے تھے۔ خون کا دورہ ان کی رگوں میں سست پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوراک کے لئے بھی جد و جہد چھوڑ دی تھی۔ وہ عیار چھپکلی جو ہر رات دبے پاؤں روشنی کے گرد طواف کرتے والے پروانوں کا شکار کرنے آیا کرتی تھی اس رات نہ آئی اور جھینگروں نے بھی تو سر شام ہی شور مچایا تھا جبکہ سورج کی آخری شعاعوں کی گلابی گرمی کو سردی تسخیر کر رہی تھی۔ سردیوں کے شروع میں میدان میں اتر آنے والی ابابیل، جس نے ریستوران کے کلاک کے پیچھے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا، پر پھڑپھڑا کر، اپنے بچوں کو ان میں لپیٹتے ہوئے، ان کی حرارت کو صرف ہونے سے بچا رہی تھی۔

اس وقت میں بہت سے نرم و گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا اور میری تاریک یادداشت پر فراموشی کا عمل تسخیر شروع تھا۔ اچانک سگریٹ نے مجھے جگا دیا اور آنکھیں کھلتے ہی میری نظر چھت پر ایک بے قاعدہ دائرہ بناتی ہوئی چارپائی کے نیچے دو سہمے ہوئے پیروں پر جا پڑی۔ کچھ دیر اگو مگو کی حالت میں، میں ان پیروں کو گھورتا رہا۔ پھر یکایک کسی خیال کے آنے سے میں نے ان پیروں کو چھو دیا۔ چھوا ہی نہیں بلکہ زور سے کھینچا اور چلایا۔۔۔

"او زینو سنگھ بچے . ."

زینو، ان پیروں کا مالک، ایک تیس سالہ ننگ پیری نوجوان، اسفنجی کیڑے کی

طرح سکڑ گیا لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اب وہ چھپ نہ سکے گا اپنی کہنیوں کی مدد سے پیچھے کو سرکا، اکڑوں بیٹھا، بالوں کو جھٹکے سے سیدھا کیا اور بے حیاؤں کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے نظریں چرانے کی بجائے اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اسے کان سے پکڑا اور کھینچتا ہوا لیمپ کے پاس لے گیا بالکل اسی طرح جیسے وہ غبار چھپکلی کسی بڑے سے پروانے کو پکڑ کر روشنی کی طرف بڑھتی تھی۔

زینو کی آنکھیں آج معمول سے زیادہ خونی ہو رہی تھیں۔ بال بھی پہلے سے زیادہ منتشر تھے اور نچلا ہونٹ لٹک کر پان خوردہ دانتوں کی سیاہی کو نمایاں طور پر دکھا رہا تھا۔ اس کے زرد، دبلے، آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں اور اس کے چوری کے ہر روز بڑھتے ہوئے تجربے کو عیاں کر رہی تھیں۔ شاید زینو چوری کے ذریعے اپنی آمدنی کو خرچ کے برابر کرنا چاہتا تھا۔ چوری کے روپے آمدنی کو خرچ کے مساوی ہی نہیں کرتے، بڑھا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کے خد و خال کو نہیں بھرتے اور شاید اسی لئے چوری کا سائنٹیفک اور منفعت پیشہ رہا ہے۔

میں نے قدرے سختی سے کالر کو کھینچا اور مجھے یاد آیا کہ زینو کی پہنی ہوئی قمیص میری اپنی ہے، وہی جو میں نے چند دنوں کے لئے اسے پہننے کو دی تھی۔ گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"کیوں بے، سالے، بدمعاش، بولتا کیوں نہیں؟ کیا ہو رہا تھا یہاں؟"

"میں یونہی پڑا تھا، میں سوتے سوتے چارپائی سے گر پڑا تھا، میں چارپائی کے نیچے آپ کے لال اونی کمبل کو ڈھونڈ رہا تھا ——— ، وہی پھٹا ہوا کمبل جو آپ نے نجس سمجھ کر پھینک دیا ہے، وہی اوہی جس میں جوئیں چل گئی تھیں، یاد نہیں آپ کو؟

"ہاں ہاں وہی ———" دوسری قسم کی یادہ گوئی کی بجائے اس نے اپنے سر کو جھنجوڑا اور دو ٹوک جواب دیا۔

"چوری!"

اس مختصر، جامع اور نفسیات آزما جواب نے مجھے چند لمحوں کے لئے خاموش کر دیا اور میں ایک ایسی دنیا میں اڑنے لگا، جہاں ایمان، شرافت ایک اضافی بات ہو جاتی ہے اور تھوڑے سے تجربے سے دیانت داری اور چوری میں کانوں کو ہاتھ لگانے اور عادت رہتی کہاں تک والی بات نہیں رہ جاتی۔ اس پچاس تا موشی کے عالم میں میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "سالا، اپنی مذموم عادت سے باز نہ آئے گا؟ کئی مرتبہ نسبتے چوری کے الزام میں قرار واقعی سزا دی جا چکی ہے۔۔۔۔ جس طرح نیلے رنگ کا شیشہ سفید روشنی کے باقی تمام رنگوں کو جذب کرتے ہوئے نیلے رنگ ہی کو گذرنے کی اجازت دیتا ہے، اسی طرح اس کی ذہنیت بھی سب اچھی باتوں کو جذب کرتے ہوئے چوری کی طرف آزادانہ رجوع کرتی ہے!

"تم نے خان کا سوٹ کیس کھولا ہے؟" میں نے اسے آہستگی سے پکڑتے دھیمے سے کہا۔

"ہاں"

"اگر خان دیکھ لے تو؟"

نذیر کا چہرہ زرد ہو گیا تھا، تو وہ ڈرتے نہیں، مردی ہے، اندر بولا "دیکھ لے تو کچھ نہیں اس طرح آسان ہے، اگر خان سے ایسے اچھے نے مجھے پکڑ لیا ہے اور نہیں چھوڑنا، دو کا منہ چھوڑا تو کیا بگاڑ لیتا میرا۔۔۔۔"

میری بات کے جواب میں زینو یہ بھی کہہ سکتا تھا! آپ ہی کی قمیض پھٹ جاتی نا...... میرا کیا بگڑ جاتا؟ اور یوں دریدہ دہنی کے علاوہ ایک لطیفہ ہو جاتا۔ لیکن اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ کیا کسی لطیفے سے کم تھا؟ میں نے مرعوب ہوتے ہوئے اس کی آستین کو چھوڑ دیا۔ پھر کولہے کو دو تھپکیاں، بٹن بند کئے اور اس کے کندھے تھپکتے لبوں سے ایک پیسے کی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاباش! اللہ تمہارے نیک ارادوں میں برکت دے، بیٹا!"

اور پھر ہنستے ہوئے میں نے غصے سے کہا "جیل خانے کی ہوا راس آئے گی تمہیں، اُلو کے پٹھے!"

اسی وقت زینو نے انگلیوں کی کنگھی بنائی، اپنے منتشر بال درست کئے اور اپنے گھٹنوں سے مٹی جھاڑی۔ میری بات کے جواب میں وہ تندیسے دلیری سے بولا۔

"آپ کے خیال میں جیل کی زندگی اس زندگی سے بری ہے؟ وہاں بھی اللہ روٹی دے، اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین......"

میں نے دل میں سوچا "عجب ہے اللہ!" اور پھر میں نے کہنا چاہا۔ اللہ میرا بھی تو رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین مجھ پر بھی تو عائد ہوتا ہے اور یہ بڑا قصور پہ آج خان پر جس کا سوٹ کہیں تم نے ابھی ابھی ناپاک ارادے سے کھولا ہے۔

.... اور پھر زینو خود ہی چپ چاپ ڈیشدار کی خالی چوکی پر بیٹھ گیا۔ شاید وہ اندھیرے میں بیٹھ کر اپنی ندامت کو چھپانا چاہتا تھا۔ میں پھر ہوٹل جو تنگ تھا بستر میں جا گھسا اور ایک کونے سے اسے دیکھنے لگا۔ زینو نہایت بے چین ذرا سا بیٹھا اپنے دانتوں کی میل کو کرید رہا تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے قمیض کی تہہ

گرہن

[illegible] لمبا سانس لیا اور سوچا، زینو کچھ بھی کرنا چاہتی ہے [illegible] لئے
[illegible] اور خود اٹھ کر [illegible] بند کر دیا [illegible] خان نے
[illegible] اور [illegible] اٹھا لیا۔
[illegible] اپنے [illegible] شاید خون کا دورہ [illegible] سست
پڑ چکا تھا۔

زینو کا پورا نام زین العابدین تھا ـــــ عابدین کی زینت لیکن جو رہی
عجیب سی کی عبارت ہے جس کی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں شاید غلطی سے رہ گئی
ہے۔ [illegible] اور زیر دستی کو دیکھ کر بھی جاگ اٹھتا ہے، اپنی تعریف سے
بھی جس سے مس نہیں ہوتا یا وہ کوئی بڑا پہاڑ ہے تو زینو اسم با مسمیٰ تھا۔

حقیقت میں زینو کا کوئی خاص نام نہ تھا [illegible] اس لیے کہ سب اس سے واقف
[illegible] تھے ـــــ محبت جو نفرت کے بعد پیدا ہوتی ہے [illegible] جذبات
[illegible] اور جگہ مناسبت سے رکھ لیا
جاتا تھا۔ اس مستقل نام کے نہ ہونے کا فائدہ [illegible] تھا لیکن شدید تھیں۔ زینو میں شدت
[illegible] نہ تھی۔ وہ [illegible] اور [illegible] تھا [illegible] میں
[illegible] سے ہوتی تھی . . . . لیکن شاید زینو کو خیال [illegible] اور [illegible] قسم کے
[illegible] ناموں سے [illegible] رہ گئے ہیں [illegible] ایسے ہی کسی آسان نام
سے [illegible] کوٹھڑی میں [illegible] والے [illegible] سب کے سب زینو کے
[illegible] اپنے [illegible] نام سے پکارنے لگے اور

بعد ایسے دیتا، کہہ کر ٹالتے تھے۔ شریف کاتب اسے رسالا اٹھا دیتا اور زینو جب سالے کے نام پر ایک کہتا تو شریف کو ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی۔ وہ مخمصہ جو گڑ کی ڈلی یا میٹھی خارش کے مشابہ ہوتی ہے اور عموماً ایسے رشتوں سے ہی حصے میں آتی ہے — کوئی نوعمر خود باپ تھا اور کوئی بہنوئی؛ اور اسی طرح بغیر کسی عورت کے وہاں ایک بڑا سا کنبہ بس رہا تھا۔

ہماری کوٹھڑی میں ایک نومسلم راجپوت رہتا تھا۔ خان اسے شوق سے مہدی اسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اس شخص کا پیشہ نقلی چیزوں پر پیٹنٹ کے لیبل چسپاں کر کے بیچنا تھا۔ مہدی اسلام نومسلم ہونے کی وجہ سے بہت پارسا اور نمازی تھا اور چونکہ خود تجرد پسند تھا۔ اس لیے زینو کو سالے کی بجائے ماموں کہہ دیا کرتا تھا۔

زینو کی مجھ سے پہلی ملاقات ایک حادثے کی نوعیت رکھتی تھی۔ ریل پکڑنے کے لیے جو بلوے میں بری طرح مجروح ہو کر ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں معلوم ہوا زینو کا چچا یا تایا تھی۔ اسے غالباً چوری کے الزام میں پیٹا گیا تھا۔ اس کا چہرہ، ناک اور ہونٹوں پر زخم تھے۔ ان میں سے دو آنکھیں باہر کو نکل رہی تھیں۔ منہ سے خون جاری تھا۔ اس کی جیب میں دو روپے تھے جو اس نے نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھے تھے۔ ناگفتنی باتوں کے سلسلے میں اس نے مجھے بلایا اور پوچھا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"دارالترجمہ میں نوکر ہوں" میں نے کہا۔

"کیا نوکری ہے؟"

"مدیر اول"

"دبیرِ اوّل کیا ہوتا ہے؟"

"ہیڈ کلرک ـــــ بڑا کلرک، منشی، بڑا منشی، بڑا بابو" میں نے ذرا وضاحت سے کہا۔

زبنو جو اس وقت بیٹھا ہوا تھا مایوس سا ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس وقت دونوں دانت اس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے تھے جنہیں وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ جماہی لیتے ہوئے بولا:

"میں نے سمجھا آپ ضلع کچہری میں چپراسی ہیں۔"

میں نے اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے کہا "آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"آپ کی شکل سے" اس نے بلا تامل کہا۔

میں نے خجل ہو کر سر کو گرا دیا۔ دانت برآمد کرتے ہوئے زبنو ایک نئے انداز لہجے میں بولا "ان حرامزادوں نے میرے دو دانت توڑ دیے ہیں۔ اب بھلا یہ دودھ کے دانت تھوڑے ہیں جنہیں سورج کی طرف پھینک دیا جائے گا اور وہ پھر سے پیدا ہو جائیں گے کیا آپ کا کوئی تحصیل (وکیل) واقف ہے۔ جو کورٹ کی کچہری (ہائی کورٹ) تک پہنچا ہو؟ میں نے سنا ہے دانت توڑنا سرکار میں بڑا جرم ہے۔ دانت توڑنے والے سے پچاس روپے ہرجانہ (جرمانہ) وصول کر کے دانت کے مالک کو دیا جاتا ہے۔ اب میرے پاس مقدمے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ آپ مقدمہ کر کے ان دو دانتوں کا سو روپیہ لے لیں، اور پچاس مجھے دے دیں۔ مجھے بڑی ضرورت ہے۔"

"بھلا اس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کیا ہو گا" میں نے سوچا اور پھر زبنو سے بھی زیادہ گہرے رازدارانہ لہجے میں میں نے کہا "سو؟ ـــــ شاید تمہیں دو سو

مل جائیں۔ ان دانتوں کو نیلام گھر میں پہنچا دو۔"

اس وقت زینو تقریباً ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں نے نئے نئے سینکڑوں چٹکلوں سے اور خوب صورت عورتوں کی تصویریں دکھا کر اس کے زندگی میں مٹتے ہوئے یقین کو جلا دی۔ میری رفاقت میں وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔ میں نے اس سے بھی ایک قدم آگے اٹھایا۔ زینو جو کہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ جس کی بے کسی کا احساس کرتے ہوئے، یا دوسرے لفظوں میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن اس نے آتے ہی گوناگوں مصیبتوں میں مجھے مبتلا کر دیا۔ بارہا میں سوچتا ہوں میں نے کیا برا کیا جو ایک بازاری کتے کی طرح ارزاں، ایک کیڑے کی طرح بے قیمت انسان کو قعرِ ذلت سے اٹھایا اور اپنی کوٹھی میں بسنے والے شریف زادوں کا نزدیکی بنا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر میرا ذہن خود ہی جواب دیتا ہے۔ تمہارا ہی تو سب قصور ہے کہ تم نے ایک کیڑے کو آستین میں رکھا۔ کیڑے کی صحیح جگہ گندگی ہے۔

پھر خیال پیدا ہوا اس نیک کام کے کرنے میں جذبات نے تمہیں کتنا حظ دیا ہوگا جسے تم روحانی حظ کہتے ہو۔ اس تھوڑے سے حظ کی تمہیں قیمت دینا ہوگی جذبات! ——— جذبات ہمیشہ آدمی کو خرد سے مہنگے پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی میرے بہت ہی قریب ہو کر پوچھے کیا تم دیرپا خرد پسند کرو گے یا وقتی جذبات کو، تو میں بلا تامل کہوں گا ——— جذبات کو!

عادت! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سگریٹ پیتے پیتے اونگھ جاتا ہوں اور جب آنکھ

جلتی ہے تو چونک اٹھتا ہوں۔ ایک دن کسی مترجم کی وفات پر دارالترجمہ میں چھٹی تھی اور میں دوپہر ہی کو اپنی کوٹھڑی کی چھت پر دھوپ میں پڑا اونگھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بدستور سگرٹ تھا جبکہ نیو جہانگیر ریسٹوران کے ایرانی نژاد چھوکرے نے پیکدان لاکر میرے پاؤں میں رکھا۔ ابھی سگرٹ نے میرا ہاتھ بھی نہ جلایا تھا کہ سیڑھیوں پر دھما دھم کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جاگ اٹھا۔

خان، وحید، مہدی اسلام، ریسٹوران کا منیجر سب کے سب میرے سامنے کھڑے تھے اور چیخ چیخ کر میرے دماغ میں گھسا چاہتے تھے۔

"میری گھڑی لے گیا ہے سالا" شریف نے کہا۔

"اور میری شیشہ کی کنگی" خان آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

ریسٹوران کا منیجر کہنے لگا "تین روپے سات آنے کا بل دو ماہ سے واجب الادا ہے"

سب سے آخر میں مہدی اسلام بولا۔

"میرے پانچ ارڈر لئے ہیں ماں کے خاوند نے......"

مہدی نے وہ گالی ذرا وضاحت سے نہ دی تھی۔ میں نے سوچا شاید مہدی نے ماموں بھانجے کا رشتہ بدل دیا ہے اور اسے ماں کا خاوند بنا لیا ہے۔ یہ سب رشتہ عجیب ہے۔ آخر یہ پارسا اور نمازی لوگ گالی دینے کے لطیف فن میں ماہر کیوں نہیں ہوتے۔ معمولی سی وضاحت 'لفظ' اپنی کے اضافے سے ایک جامع گالی ہو جاتی۔ خیر! میں نے سب کو فرداً فرداً سمجھایا۔ وہ احمق اپنے نقصان کی تلافی مجھ سے چاہتے تھے۔ کیونکہ میں نے ہی انہیں وہاں لا کر رکھا تھا اور زندگی کی سب حرکتوں

کے لینے میں ہی ذمے دار تھا۔ یہ کیا کم رعایت تھی کہ زینو سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا اور اسے دارالامان (ہماری کوٹھری کا نام) میں پناہ دی جاتی تھی؟ شاید وہ سب لوگ مجھ سے بہت نامناسب سلوک کرتے اور لڑائی کی صورت میں تو شاید ایک ایک دو دو ہڈیاں ہی ان کے حصے آتیں لیکن میں نے ضامن بنتے ہوئے کہا کہ اگر زینو شام تک نہ لوٹا تو میں ٹیم کو سب کا نقصان چکا دوں گا۔ ان سب کو ٹیم کی بندش پر اعتراض تھا میں نے دراصل سوچ رکھا تھا کہ بالفرض زینو شام تک نہ آئے تو بھی ٹیم میں جمعہ جمعہ آٹھ ——— پورے آٹھ دن پڑے ہیں۔ اور میرے رفیق مجھے کم از کم اتنی رعایت تو دے سکتے ہیں کہ زینو کے ٹیم سے پہلے پہلے آجانے پر مجھے چھوڑ دیں۔

اس کے بعد میں "ٹوٹا ہوا دل" دیکھنے کے لئے سنیما چلا گیا جب رات کے دس بجے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ خان کی لنگی کھونٹی پر ٹنگی تھی اور شیشم کی تپائی پر شریف کی گھڑی رات کے سناٹے میں ٹک ٹک کر رہی تھی۔ کونے میں میرے سوئیڈ کے بوٹ رکھے تھے جو میں نے چند دن ہوئے بالکل نئے خریدے تھے۔ وہ انہیں ابھی تک گھس جانے کے خوف سے نہیں پہنتا تھا اور اپنے پرانے جوتوں کو لگاتار استعمال کرتا رہا تھا۔ اب وہ وہاں کیچڑ میں لت پت پڑے تھے اور اژدہے کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھے۔ غالباً زینو انہیں بھی پہن گیا تھا جس کا مجھے علم ابھی تک نہ ہوا تھا۔ اپنے بوٹوں کے یوں خراب ہو جانے پر میں بہت غمگین ہوا۔ میں نے وحید سے کہا۔ "وحید! اس کا مطلب ہے زینو آ چکا ہے واپس؟" وحید نے ایک پرانی سی جنتری جس کی وہ ورق گردانی کر رہا تھا نیچے پٹخ دی اور کونے میں مٹی کی طرف اشارہ کیا۔

گرہن

کمرے میں زینو بیٹھا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ مٹی سے اٹا پڑا تھا اور پاس ہی نیچے کا لب بری طرح لٹک رہا تھا۔ میں نے اس وقت بھانپ لیا کہ تعلقداروں نے مل کر اسے بڑی طرح سے پیٹا ہے۔ آج میں بھی اس پوزیشن کو پیٹنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے میرے سویڈ کے بوٹوں کا ستیاناس کر دیا تھا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑا اور ہمیشہ کی طرح لیمپ کے نزدیک لاتے ہوئے پوچھا۔

"ابے تو میرا بوٹ پہن گیا تھا، کس نے اجازت دی تھی تجھے؟"

لیکن زینو نے میری طبیعت کے کمزور مقام کو پا لیا تھا جیسے خطرے کے وقت جانور عقل حیوانی سے اپنے بل کو پا لیتے ہیں۔ وہ اپنے سیدھے سادے لفظوں سے مجھ میں ایسے جذبے بیدار کر دیتا کہ میرے ہاتھ اٹھتے اٹھتے رک جاتے۔ وہ بولا۔

"آپ لوگوں کو خیال ہی نہیں آتا جب آپ بوٹ پہنے دیے پھریں اور میں اتنی سردی میں ننگے پاؤں پھروں تو یہ کیا انسانی (انسانیت) ہے، دیکھو تو میرے پاؤں کیسے سوج رہے ہیں۔"

اور زینو اپنے ننگے پاؤں دکھانے لگا۔ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے اور سوجے ہوئے تھے۔ ایڑیوں اور تلووں پر آوارگی اور مصائب کے ایک لمبے چوڑے نقشے کے کنٹور تھے جس میں زمانے کے ترقی پسند مصور نے خون کے دریا بنائے تھے۔ میں نے زینو کی گردن چھوڑ دی اور بوٹوں کو پاؤں میں پہن کر دیکھا ——— میرے سویڈ کے بوٹ دو بالشت کے قریب کھل چکے تھے اور کیچڑ میں جھک کر ایک گدھے کی نعش کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

بالکل ایک ہی کمرے میں کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک انسان چیتھڑوں میں لیٹا رہے اور دوسرا اس کے سامنے سگڑی سے آگ تاپ رہے؟ ایک انسان کے پاؤں سردی سے پھٹ جائیں اور دوسرا نرم و گرم موزے زیب تن کرے ایک انسان گرم گرم چائے کافی یا برانڈی پی کر وقت اور مقام اور اضافیت کے جدید نظریوں پر بحث کرے اور دوسرا ان باتوں سے بے خبر ایک کونے میں دبکا ہوا شدت کی تنہائی اور جنسیت محسوس کرتا رہے؟ ایک شخص کے پاس ہوس رانی کے لئے وافر روپیہ پیسہ ہو اور دوسرے کو اس سے محروم رکھ کر اس میں جنسی عیوب پیدا کئے جائیں۔

ان دنوں میرے ہاتھ نفسیات کی ایک کتاب آ گئی جسے پڑھ کر میں نے زینو کی اس قبیح عادت کے ہر پہلو پر غور کیا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا کہ زینو کی اس عادت کا باعث محرومی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ بچپن ہی سے اسے ہر چیز، ہر نعمت، زندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ علم، تہذیب، مذہب، شرافت اور قانون کی آڑ میں اس کے قدرتی حقوق غصب کئے گئے ہیں۔ اسی لئے وہ چوری کرتا ہے۔ دوسروں کے بوٹ، لنگیاں، گھڑی اور سویٹر کے پیٹ چھین کر وہ نفس کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے اور اب چوری ایک دیرینہ بیماری کی طرح جڑیں پکڑ چکی ہے۔ اس کے انسداد کے لئے کتنی اکسیر کی ضرورت ہو گی۔ کتنا کام زیر زمین کرنا پڑے گا۔ کتنا وقت درکار ہو، اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے ......

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ [illegible] زینو کو [illegible] انگشت تر وہ پہلے ہی گھل چکے ہیں۔ ان کا مجھے فائدہ ہی کیا۔ اس کے علاوہ میں نے سوا پانچ روپے میں کھدر دار امانا خاکی پٹو کا کوٹ زینو کے لئے خرید لیا تاکہ وہ سردی سے نہ کانپے بلکہ

سن کر میری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے اور میں چپکے سے سہ جاؤں ــــــ
جذبات ہی تو ہیں!

میں خراماں خراماں گھر کو لوٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج زینو کتنا خوش ہوگا۔ وہ مجھے کیسا فرشتہ سیرت سمجھے گا۔ اس خوشی میں وہ کتنی چھلانگیں لگائے گا مجھ سے لپٹے گا۔ کہے گا "اللہ تمہیں ایک خوبصورت بیوی دے۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین۔۔۔۔

میں نے "دارالامان" میں قدم رکھا۔ زینو اسی طرح ایک اجنبی کیڑے کی مانند سکڑ کر ایک کونے میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا آج شاید پھر اس غریب الدیار کو کسی نے مارا ہے۔ میں ان جذبات سے کورے، عقل مند وحشیوں کو اس کی اچھی طرح سزا دوں گا۔ میں ان لوگوں کو اب بھی خرید سکتا ہوں۔ زینو کے ان سے تمام رشتے ناطے توڑ سکتا ہوں لیکن نہیں۔ زینو کو کسی نے نہیں پیٹا تھا۔

میں نے کونے میں پڑے ہوئے زینو کو کان سے پکڑ کر اٹھایا۔ یہ حرکت میں نے اس وجہ سے کی کہ زینو سمجھے گا کہ آج پھر مجھے کسی جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے اور اسی شک وہیم کے درمیان جب اسے پتہ چلے گا کہ اسے کوٹ اور بوٹ بخشیش میں دیئے جا رہے ہیں۔ تو اس ڈر کے مقابلے میں خوشی کتنی ہولناک طور پر خوبصورت ہوگی۔

میں نے زینو کے کانوں کو اچھی طرح سے مروڑا۔ درد کے ایک احساس سے وہ آہستہ سے کراہ اٹھا۔ لیکن اس نے مطلق نہ پوچھا کہ وہ سزا اسے کیوں دی جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اب کانپ رہا تھا سردی سے نہیں، خوف سے، کیونکہ اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا۔۔۔۔۔۔

میں نے کہا "دیکھو بیٹا، تیرے لئے کوٹ لایا ہوں"

ایک لمحہ میں زینو کا خوف دور ہو گیا۔ وہ میرے قریب سرک آیا اور گھوٹنے کی چٹی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی فرشتہ میٹھے وقت اپنے پر سنوارتا ہے۔ اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا :-

"وہ بوٹ بھی اب تمہارے ہیں"

زینو مسکرایا۔ بالکل خفیف طور پر۔ اس نے جیسٹر مجھ سے لیا اور اسی وقت اسے کندھوں پر ڈال لیا اور بولا :

"میں جانتا تھا! تم میرے لئے کوٹ لاؤ گے ..... تم مجھے بوٹ دے دو گے، یہ بھی جانتا تھا"

اور اس کے بعد وہ کوٹ کے بٹن احتیاط سے بند کرتے ہوئے اپنی چٹائی پر جا لیٹا۔ مجھے اس کی ناشکر گزاری پر سخت غصہ آیا۔ میں نے دل میں کہا۔ آئندہ میں زینو پہ ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ اس کا فائدہ ہی کیا؟ اس نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے بعد جب میں خان کے ساتھ چارپائی پر لیٹا تو مجھے غصہ کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک خیال رینگتا ہوا میرے ذہن میں آیا۔ کیا اس کے بعد شکر گزاری کی ضرورت ہے؟ گویا کیڑے کو گندگی میں سے اٹھانے اور ڈنک سہنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک خاص قسم کا حظ محسوس ہوا۔ جیسے کوئی مجھے کوٹ اور بوٹ کی قیمت ادا کر رہا ہو!

ایک دن میرا ایک مترجم دوست میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے زینو کا تذکرہ

کیا اور خاص طور پر زبیو کو کوٹ اور بوٹ مہیا کرنے کا واقعہ سنایا۔ اس نے میرے جذبات کو سراہا۔ مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی اور میرا رُواں رُواں شدتِ احساس سے جاگ اٹھا۔ میرے دوست نے بتایا۔ زبیو کی چور ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کے ہاتھ میں پیسہ نہیں دیا گیا ہے جسے وہ آزادانہ خرچ کر سکے۔ ایک کوٹ یا جیسٹر کی بجائے اس کے ہاتھ میں کچھ نقدی دینا بہتر ہوگا ایسی نقدی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکے۔"

اس کے بعد وہ مترجم رخصت ہوا اور میں نصف شب تک اس بات پر غور کرتا رہا۔ اگلی صبح میں نے زبیو کو پاس بلایا اور ایک روپیہ اس کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

"زبیو، بیٹا . . . . لو یہ خرچ کر لینا لیکن ذرا احتیاط سے . . . . جب ختم ہو جائے تو میں تمہیں اور دوں گا۔"

اس دن میری طبیعت نہایت پُرسکون رہی۔ شام کو آیا تو میں نے باتوں باتوں میں روپے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ زبیو روپیہ کتنی احتیاط سے خرچ کرتا ہے۔ لیکن شام سے پہلے پہلے زبیو نے روپیہ ختم کر ڈالا تھا اور دو روپے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ جب میں نے جیب میں سے دوسرا روپیہ نکالنے کو ہاتھ ڈالا تو میں ٹھٹھک گیا۔ اگر اس حساب سے روپے خرچ ہونے لگے تو دیر لگے کی درخواست دینی پڑے گی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا گویا خرد بہ بانگِ دہل کہہ رہی تھی۔ "اب کھو!"

لیکن میں نے خرد کو جذبات پر غالب نہ آنے دیا۔ میں نے کوشش عمل کے

جیب سے ایک روپیہ نکالا اور کہا:

"زینو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لو ایک روپیہ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس میں ایک ہی دے سکتا ہوں لیکن یوں گذارہ نہ ہوگا۔ احتیاط سے خرچ کرنا۔"

اس کے بعد جب میں شام کو دفتر سے لوٹا تو زینو پہلے سے موجود تھا میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے روپیہ میرے سامنے پھینک دیا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں زینو؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک پیسہ میری جیب میں رہتا ہے" زینو بولا "مجھے سکون میسر نہیں ہوتا۔ گویا وہ میری جیب سے اچھلا پڑتا ہے جب تک اسے خرچ نہ کر ڈالوں۔ مجھے بہت کوفت ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے سخت تذبذب میں روپے کو ہاتھ میں تھامے رکھا اور لیمپ کے گرد طواف کرنے والے ایک پروانے کو دیکھنے لگا۔ عجیب بات تھی۔ زینو کو ایک روپے کو خرچ کرنے کی بھی اہلیت نہ تھی۔ ایک روپیہ جیب میں ڈال کر اسے خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ لذیذ ترین مٹھائیاں، خوب صورت ساڑیوں میں ملبوس عورتیں اور کیا! کچھ نہیں خرید سکتا۔ گویا وہ ایک چھوٹا برتن ہے جس میں زیادہ چیز نہیں سما سکتی۔ وہ ایک روپیہ بھی جیب میں نہیں رکھ سکتا اور جب اس کی جیب خالی ہوگی تو وہ چوری کرے گا اس پر ایک تجربہ طاری ہو چکا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کیا مجھ سے زیادہ بعد ازاں آدمی بھی کوئی ہوگا جسے ہر روز ایک سا روپیہ دے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جذبات! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جذبات جو کہ چوری سے بھی زیادہ مسموم انگیز ہیں۔

چوری سے زینو کو روکنا بے سود سمجھ کر میں نے اس ضمن میں اسے کچھ کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

اسی شہر کے محلہ قاضی عبدالغفار میں میری ہمشیرہ رہتی ہے۔ میرے بہنوئی محکمہ ڈاک میں ایک اچھی، گزارے کے لائق آسامی پر متعین ہیں۔ میری ہمشیرہ کے تین بچے اور دو مکان ہیں۔ شہر میں میرے بہنوئی کا کافی رسوخ ہے۔ کچھ دنوں سے میں شادی کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اب میں تیس برس کا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سے گرم ملک کا باشندہ تھا اور کثرت سے چاٹ کھانے کا عادی۔ شروع جوانی میں پھوپھی اور خالہ کے ہاں سے رشتے آتے تھے۔ مگر مجھے ان دونوں لڑکیوں سے کچھ چڑ تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں خوب صورت اور بے وقوف تھیں۔ اس کے بعد ہمشیرہ کہنے لگی۔ وقت گزر چکا ہے اور اب تو میرے سر میں کہیں کہیں سفید بال دکھائی دینے لگے تھے۔ ہندوستان کی اوسط عمر سے زیادہ ہو چکا تھا اور یہی کیا کم غنیمت تھا؟ لیکن میں ایک عورت کی شکل دیکھے بغیر ہی مر جاتا تو کیا جنت کے دروازے مجھ پر کھلے رہتے؟ میں نے ارادہ کیا کہ کسی معتبر آدمی کے ذریعے شادی کے متعلق کہلوا بھیجوں اور جب ہمشیرہ تھوڑا سا بھی اصرار کرے تو مان جاؤں۔ آخر کھانا پکانے کے لئے بھی تو ایک عورت چاہئیے۔ گویا میں سارا دن مردانے میں بیٹھا رہوں گا اور بیوی باورچی خانے میں!

اور دل کہہ رہا تھا۔ دارالامان کی جگہ المنظر کی ضرورت ہے، زینب خالہ کی لڑکی خوب صورت ہے تو خوب صورت ہی سہی۔ بے وقوف ہے تو بے وقوف ہی سہی۔ باورچن تو اچھی ثابت ہو گی۔

اس کام کے لئے میں نے جس معتبر شخص کو ڈھونڈا وہ زینو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ زینو کافی عرصے سے میری ہمشیرہ کے ہاں متعارف تھا۔ ویسے حاجی گومن پاجی گوگم کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے زینو کو رضامند کیا کہ وہ وہاں پہنچ کر میرے لئے زمین تیار کر دے۔ میری شادی کا تذکرہ چھیڑے۔ ہمشیرہ جو مدت سے میرا گھر آباد دیکھنے کی خواہش مند ہے مجھ سے خود ہی اصرار کرے گی اور پھر میں زینب کا قصہ چھیڑ دوں گا۔

ایک نیک ساعت دیکھ کر میں اور زینو گھر پہنچے۔ ہمشیرہ قریب آ کر بیٹھی تو میں عمداً کسی بہانے سے وہاں سے چلا گیا۔ دراصل میں بغل کے دروازے کے پاس کھڑا سب کچھ سنتا رہا۔ زینو کہہ رہا تھا۔

"ان کی شادی کیوں نہیں کر دیتے آپا؟"

"ما نے بھی" آپا بولیں۔

"اصرار بھی تو نہیں کیا آپ نے کبھی۔"

"اصرار کی خوب کہی تم نے" ہمشیرہ غالباً ہاتھ پھیلا کر بولی "اس دھینگے آدمی نے پھوپھی اور خالہ کے سامنے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اب تو میں اسے کبھی نہیں کہنے کی۔"

میں تلملا کر رہ گیا لیکن میرا ہونہار وکیل کہنے لگا۔

"بچپن تھا نہ آپا اس وقت تو ....."

ہمشیرہ غالباً ایک چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتی ہوئی بولی۔

"میں تو کبھی نہ کہوں گی، تم منالو اسے ...."

میں موقع مناسب دیکھ کر کمرے میں داخل ہوا اور ادھر ادھر تصویروں پر نگاہیں

ڈالتے ہوئے بیٹھ گیا ہمشیرہ چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"پی لو ایک پیالی" اور پھر بولی "شادی کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟"

ضروری تھا کہ ہمشیرہ کے سامنے میں جھوٹا سچا انکار کرتا۔ میں نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا "شادی؟ توبہ! توبہ!! میں اس راہ میں بھٹکنا نہیں چاہتا میرا مطمحِ نظر شادی سے کہیں بلند ہے۔"

زینو نے آنکھ مارتے ہوئے کہا "اور باورچن؟"

میں نے چلاتے ہوئے کہا: "بکواس بند کرو! زینو کے بچے جہانگیر ریسٹوران میں بُرا کھانا ملتا ہے کیا؟"

اب جو کچھ زینو نے کہا وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا اور مجھ سے مانگ کر پہنی ہوئی پتلون کے گیٹس کو کھینچتے ہوئے بولا۔

"ایسے بے ڈھب انسان مجھے بالکل پسند نہیں۔ خود ہی مجھے تیار کیا کہ میں جا کر شادی کے لئے زمین تیار کر دوں اور اب مجھے ہی خجل کرنا چاہتے ہو کیا؟"

زینو جتنا خجل ہو سکتا تھا ہو چکا تھا اب میری باری تھی پسینے کے قطرے اتنی سردی کے باوجود میری پیشانی پر پیدا ہو گئے۔ میں ہمشیرہ کے سامنے برابر انکار کرتا رہا مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا زیادہ سے زیادہ میں نے یہ کیا کہ ننھے بھانجے کو گودی میں اٹھا لیا اور بہنوئی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا!

"یہ کس کے ابا ہیں! تمہارے؟ ارے منّو کتنے ہو؟ ارے تو ابا کتنے گندے ہو تم؟"

گرہن

اور پھر ہمشیرہ کے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے کہا:

"یہ بھی کہنا ہوگا، اچھا ماموں ہے میرا۔ بالکل خالی ہاتھ چلا آیا۔"

اور اپنے بھانجے کے گالوں کی چٹکی لیتے ہوئے میں نے کہا:

"اب کی دفعہ میں تمہارے لئے چیری لاؤں گا۔ چیری اور ٹافی...... کیا تم نے کبھی ٹافی بھی کھائی ہے؟ .... ٹافی چیری سے بھی زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔"

میری ہمشیرہ مسکراتی رہی۔ اس کے بعد ہم نے رخصت لی۔ راستے میں میری زینو سے خوب لے دے ہوئی۔ میں نے کہا "تمہیں دارالامان میں چل کر بیٹھوں گا سالے"، گویا پیٹنے کے لئے دارالامان سے زیادہ موزوں اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔ میں پراگندہ دل کے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اپنی بید کی چھڑی تلاش کرنے لگا۔ یہاں مہدی اسلام ہمارا انتظار کر رہا تھا اور وہ بید کی چھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پتہ چلا کہ زینو نے مہدی کا پین چرا کر اس کی نب صراف کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، یہی چار آٹھ آنے لئے ہوں گے۔ مقتول ٹم کا جسم نالی میں سے ملا۔ بیچارے کے سر سے نیلا نیلا خون بہہ رہا تھا۔ زینو کی قمیص کی جیب پر سیاہی کا ایک بڑا سا دھبہ چوری کا شاہد تھا۔

اس دن میں نے دونوں ہاتھوں سے پیٹتے زینو کو پیٹا اور کہا: "نکل جاؤ سور کے بچے...... شہدے، حرامزادے، نکل جاؤ فوراً یہاں سے۔"

اسی وقت میں نے زینو کو سیڑھیوں میں سے دھکا دیا۔ دو چار سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا آخری سیڑھی پر جا رکا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد زینو اٹھا اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اسے کسی بات پر یقین نہ آتا ہو۔ جب وہ کچھ دور جا کر میری جانب دیکھنے

کیسے نہ رکا تو اس خوف سے کہ کہیں وہ اپنی عقلِ حیوانی سے مجھ پر فتح یاب نہ ہو جائے میں نے دیوار کے قریب سے ایک اینٹ اٹھائی اور زبیو کی ٹانگ پر دے ماری۔ زبیو کی چیخ ریسٹوران تک سنائی دی اور وہ بلبلاتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے ایک اور اینٹ پھینکی۔ زبیو لنگڑاتا ہوا اٹھا اور اسی حالت میں رینگتا ہوا آہستہ آہستہ شام کے سیاہ منجمد اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔

اس سخت سردی کی رات میں جبکہ جھینگر بھی سرِ شام ہی سے شور مچانا چھوڑ دیتے ہیں میں اپنے بستر میں لیٹا، اس کی نرم سی گرمی محسوس کرتا ہوا سوچتا ہوں۔ میرے سینے میں دل حرکت کرتا ہے۔ میری قوتِ متخیلہ بڑی بلند نہیں ہے۔ جب وہ ریل کی لائنوں یا دریا کی گہرائیوں کو ناپتی ہے۔ تو یہ دل شدت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ جب شریف کاتب جغرافیے کے ایک کورس کی کتابت کرتا ہے تو مجھے وہ لفظ دکھائی دیتے ہیں "زمین اپنے محور کے گرد حرکت کرتی ہے" میں سوچتا ہوں۔ کیا عجب جو وہ ساکن ہو جائے اور جب کتاب کے ساتھ نقشہ دکھائی دیتا ہے تو میں حیرت سے پوچھتا ہوں یہ کس زمین کے نقشے ہیں؟ یہ ہلکے ہلکے، پتلے پتلے دریا جو نیلے رنگ میں دکھائے گئے ہیں۔ ان کا قدرتی رنگ تو سرخ ہے۔

یہ مصنف کتنی سنجیدگی کے ساتھ وقت، مقام اور اضافیت کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ سخت سردی میں منجمد ہو جائیں گے۔ اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارا ایک معبود ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے تو اس وقت مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں دارالامان کے اندر بڑی

تیزی سے اِدھر اُدھر گھومتا ہوں اور گِنتا ہوں۔ میں کیوں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ کہ مجھے باورچی کی زیادہ ضرورت ہے یا زینو کی۔

خان کی مشہدی لُنگی شب و روز کھونٹی پر لٹکی رہتی ہے اور شریف کی گھڑی صبح و شام تپائی پر پڑی ٹک ٹک کرتی ہے۔ جہانگیر ریسٹورنٹ کا بل ادا کیا جا چکا ہے۔ فونٹین پن کے پیسے بھی چکا دیئے گئے ہیں لیکن اب بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے۔ لیکن میرا قرض خواہ کوئی بڑا بے نیاز آدمی ہے جسے اپنے پیسے کی رتی بھر بھی پروا نہیں۔

جب سے اپنا سوٹ کیس کھولتا ہوں تو مجھے فوراً ہی اسے بند کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے کونے میں دو دانت پڑے ہیں اور ایک کونے میں سفید سے لکھا ہے۔ زین العابدین یعنی عابدوں کی زینت!

کل ہی میں نے فلیکس کا ایک نیا بوٹ خریدا ہے جب میں اسے پہنتا ہوں۔ تو وہ چیختا ہے، چلاتا ہے۔ بھلا اسے کس بات کا رونا ہے ——؟ نئے نمبر سے کا ہے نا، اور وہ کم بخت چیسٹر بھی تو میرے بھاری جسم پر پورا نہیں آتا۔

جب ہم شام کو سوٹ پہن کر دارالامان سے نکلتے ہیں تو ہم کتنے مہذب انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ہنستے ہیں لیکن تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ آخر والدین نے ہمیں تربیت دی ہے۔ ہم مفلر کو گلے میں اور موزوں کو پاؤں میں خوب کھینچتے ہیں تاکہ سردی لگ جانے کا خدشہ نہ رہے اور جب کوئی سڑک پر جاتی ہوئی لڑکی ہماری طرف دیکھ لیتی ہے تو ہم فوراً اپنی ٹائی کی گرہ کو درست کرنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی باتوں باتوں میں شریف وحید کو سالا کہہ دیتا ہے۔ وحید پورے زور

سے ایک چپت اس کے منہ پر جما دیتا ہے اور ایک ہفتہ تک وحید مسنزی کی ہتھوڑے پکڑنے والی انگلیوں کے نشان شریف کے گالوں پر دکھائی دیتے ہیں اور جب ہم اپنے اردگرد غور سے دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کا باپ ہے نہ بیٹا، بہنوئی ہے نہ سالا، ماموں ہے نہ بھانجا، گویا سب رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں۔

اللہ! تمام دنیا گمبیر شریفوں کی دنیا میں بدل چکی ہے۔ گویا ہم ایک دارالقرار، بلکہ اس سے بھی اوپر ایک خلا بہیں میں رہتے ہیں!

لارڈ سے

میرے جھونپڑے کے باہر، سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے۔ جسے گزشتہ ہفتے کی رات کو بارش نے بھر دیا ہے۔ بالکل ایک چھوٹے سے دل کی طرح، جس میں جذبات کے مدوجزر پیدا ہوتے ہیں اس گدلے پانی والے گڑھے میں بھی لہریں اٹھتی ہیں، اپنے محدود ساحلوں سے ٹکراتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں اپنے گھر کے پاس، بانسوں کے ایک ٹھنڈ پہ پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور اس گڑھے میں ملیریا کے جراثیم سے بھرے ہوئے گندے پانی کو بڑے غور سے دیکھتا ہوں۔ اسے ہلا کر اس میں کیچڑ کے بادل پیدا کرتا ہوں، اور دل بجھا رتی ہوئی عزیزہ کو آواز دے کر کہتا ہوں "عزیزہ! اگر یہ گڑھا ایک خوب صورت جھیل ہوتا تو کیا ہوتا؟"

گرہن

عزیزہ حسبِ معمول ایک سوکھی سی ہنسی ہنستے ہوئے میری بات کو دہرانے ہی پر اکتفا کرتی ہے اور میں سوچتا ہوں اگر یہ گرہن نیلے پانی کی ایک خوب صورت جھیل ہوتا تب بھی شاید عزیزہ کے دل کی دھڑکن ویسے کی ویسی رہتی ...... لیکن اس کے باوجود جھیل کا خیال آتے ہی میرے دل کا تمام جراثیم سے پٹا ہوا، گدلا پانی متحرک ہو جاتا ہے اور میں جذبات کے ڈونگے پر بیٹھا ہوا پانی میں بہت دور نکل جاتا ہوں۔ غالباً چاندنی رات ہوتی ہے اور میں وحشیانہ انداز سے گاتا ہوں —— ادھر کی چاندنی راتوں کے خدا ...... اس وقت مجھ پر آلی پور کی سی مجنونانہ کیفیت طاری ہوتی ہے اور میں خوشی اور روشنی کے ہر پرتو کو خوشی اور روشنی سمجھ کر جھیل کے وسیع پانیوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ کشمیری ڈل کے وہ تمام نظارے میرے ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ البتہ ہر سال دیکھنے کا تہیہ کرتا ہوں لیکن یہ تو سرکاری محکمہ کی نعمتیں ہیں بندوقوں والی بارکوں کا ٹھیکہ ختم کرنا ہوتا ہے اور یا میرا مختصر سا اثاثہ عزیزہ کی دھڑکن کے علاج میں ختم ہو جاتا ہے ......

بارش کے بعد چوماسا ہوتا ہے اور چوماسے کے بعد بارش، بارش چوماسے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور چوماسہ بارش کا پیش خیمہ۔ حتیٰ کہ یہ دونوں شوریدہ سر بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گھر سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد دھوپ رہ جاتی ہے۔ ورنہ اللہ کا۔ کچھ دن تک تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام شہر کوئی بھی نہیں رہا، فقط دھوپ ہی دھوپ رہ گئی ہے۔ اور بس عالم میں تنہا عمورا سائیں، ملا چاچا، پرتیم داس آنریری مجسٹریٹ اور چھپر کھٹ کے پیٹ سے ملی لگی ہوئی عزیزہ، کسی کو توقع نہیں ہوتی کہ ذخیرے کے پیپل اور لسوڑے مل کر تالیاں بجائیں۔ ورنہ ہر کسی کو

گرمی

شبنم کے گرتے ہوئے پتوں کے لئے نزست کی توقع ہوتی ہے۔ نباتات، چرند پرند خاموش، انسان و حیوان خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے قدرت کے ممتحن نے ان سے کوئی نصاب سے خارج سوال پوچھ لیا۔ اس وقت پرتیم داس کا ہیبت ناک ڈگو (کتا) اور میں، دونوں زبانیں باہر نکالے ہوئے اس گڑھے کی طرف رجوع کرتے ہیں . . . . . گڑھے میں بارش نہیں، اس کی حسین یاد باقی رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ بہشتی خیال آتا ہے ——— کبھی بارش ہوتی تھی، کبھی بارش ہوگی!

ایک شام، بارکوں کے لئے پھوس لدوا چکنے کے بعد جب میں اس گڑھے کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ گڑھے کے پانی میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے دُمدار مینڈک اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیر رہے تھے اور گڑھے کے ساحلوں پر لا تعداد لاروے چمٹے ہوئے تھے۔ کبھی کوئی لاروا یک لخت اپنے سمندر کے ساحل کو چھوڑ دیتا اور لاپرواہانہ کھلنڈرے پن سے اپنی دم کو سر کے ساتھ لگاتا، چھوڑتا ہوا بہت دور تک پانی میں نکل جاتا اور گڑھے کی تہ میں اُگی ہوئی نباتات میں بسنے والے کرگوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا پھر اپنے ٹھکانے کو لوٹ آتا۔ دُمدار مینڈک ان ننھے ننھے جھانجوں کی طرح، بے ڈھنگے انداز سے قلابازیاں کھاتے ہوئے، کبھی سطح پر چلے آتے اور کبھی تہ میں بیٹھ جاتے۔ میں نے اسی ٹھنڈ پر کھڑے ہو کر ان جھانجوں کی ناقابلِ فہم حرکتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آخر کیا چیز انہیں بظاہر بے مقصد اور بے معنی طور پر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تیرنے کے لئے مجبور کرتی ہے؟ کونسے ریاضی رازوں کو سیکھنے میں لگے، کونسی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے یہ اپنی ہستی کو

چھوڑتے ہیں، پھر لوٹ آتے ہیں؟ پھر خیال آتا ہے شاید یہ لاروے، یہ جراثیم، یہ دُمدار مینڈک پراگندہ خیالات ہیں جو گڑھے کے دل میں اٹھتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی بیٹھے بٹھلائے مجھے خیال آتا ہے کہ کل ڈھولن کی بڑی بہو میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اپنی انگلیوں سے سامنے کے قصاب خانے کی دیوار پہ کوئی نشان بناتی تھی...... جی ہاں، اس قسم کا خیال بھی تو ایک لاروا، ایک دُمدار مینڈک ہی تو ہوتا ہے جو اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز سے تیرنے کے لئے دل کے ساحل کو چھوڑ دیتا ہے اور پانی میں بہت دور ہٹے اور فضول نباتات کے آبی مرغزاروں میں جاتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب یاد آتا ہے کہ ننھے بھورے سائیس نے میری گزشتہ ماہ کی اٹھنی ماری ہے تو میں اسے نقصان پہنچانے کے ہزاروں منصوبے گانٹھتا ہوں لیکن محسوس کرتا ہوں کہ یہ خیال بھی ایک جھانجا ہے جو کہ تیرتا ہوا دُور پانی میں نکل جاتا ہے لیکن پھر ساحل کو آچمٹتا ہے۔ گویا ساحل اس کے لئے محض ایک منزل نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ بالکل ایک ایسی حقیقت ہے جیسے میرے منہ پر خشخشی داڑھی ہے اور میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس داڑھی کو دیکھ کر ڈھولن کی بڑی بہو کبھی ہیچ نہیں سکتی کبھی قصاب خانے کی دیوار پہ اپنی انگلیوں سے نشان نہیں بنا سکتی۔ ایسے ہی جیسے میرا تمام اثاثہ عزیزہ کی ایک فضول، دیرینہ بیماری پہ ختم ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے میں کشمیر دیکھنے کے ناپاک ارادے کو دماغ میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے گڑھے میں اور کثافت پیدا ہوتی گئی اور اس میں مزید انڈے اور لاروے پیدا ہوتے گئے۔ مجھے ان بدزیب، بے ڈول، نامکمل جھانجوں سے ایک قسم کا اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان کے لئے اپنے دل کے کسی کونے میں محبت کا جذبہ

پالنے لگا —— ایسا ہی محبت کا جذبہ جو میرے دل میں، اپنے بڑے بیٹے فخر کے لئے پیدا ہوتا ہے یا اپنی شیر خوار بچی خالدہ کے لئے...... اس گڑھے میں ملیریا کے خطرناک جراثیم پل رہے تھے۔ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ نہ صرف آنریری مجسٹریٹ اور ننھے مبورے کو ملیریا ہو جائے بلکہ مجھے، عزیزہ اور میرے سب بچوں کو یہ بیماری لاحق ہو۔ مجھے ان لاروؤں سے ایسے ہی اُنس تھا، جیسے کہ مجھے اپنے پراگندہ خیالات سے محبت تھی۔ اب بھی جب کبھی صبح کو ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو میں چارپائی پر لیٹا ہوا، اپنے پراگندہ خیالات کی مدد سے، دنیائے حقیقت کے تمام ناممکنات کو ممکنات سے ہم کنار کر دیتا ہوں۔ مثلاً سوچتا ہوں کہ ٹھیکے کے سامنے کوٹھی میں بسنے والے سمیٹ کے بادشاہ کی نوجوان لڑکی خود بخود میرے پاس چلی آئی ہے...... یا آج میں نے بڑے سرکار صاحب کی جیبوں سے نوٹوں کے تمام بنڈل اچک لئے ہیں اور عزیزہ کو ساتھ لئے، ایک کار میں بیٹھا کشمیر کی طرف بھاگا جا رہا ہوں۔ اب کشمیر کے نشاط باغ میں ہوں۔ میں اور عزیزہ بڑے بڑے سرخ "گلاس" جو کہ ڈاکٹر نے اس کے لئے مفید بتلائے ہیں کھا رہے ہیں۔ ہماری ٹانگیں پانی میں ہیں اور برفانی پانی ہمارے پاؤں کو چھوتا ہوا دور کسی نامعلوم جگہ کی طرف جا رہا ہے اور جس طرح میں اپنے دل کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہوں اسی طرح اس گڑھے میں لاروں کو تیرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اب جبکہ گڑھے کا پانی سوکھتا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ ان نرم نرم جھانجوں اور ان مدبر مینڈکوں کا کیا ہوگا؟ کیا یہ چوہا سا کبھی ختم نہ ہوگا؟ ایک دن گڑھے کا پانی سوکھ جانے سے یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ جیسے میرے دل کی آبیاری نہیں ہوتی۔ کیا اس

گڑھے کی آبیاری بھی نہ ہوگی؟ میں ہر روز آسمان کے کسی کونے میں لٹکے ہوئے بادل کو دیکھا کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا بادل بادلوں کی ایک فوج کے ہراول میں آتا ہے . . . . لیکن اس دن کمیٹی کا داروغہ اس گڑھے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے قریب پڑے ہوئے کنیر کے پتوں سے اس گڑھے کو ڈھانپنے کی کوشش کی۔ لیکن مکھی کی طرح صفائی کا داروغہ بھی طبعی طور پر غلاظت کے تمام اڈوں سے واقف ہوتا ہے اور اس داروغہ کو بھی اس گڑھے کا علم تھا۔ اس کے ساتھ رامو کہار، ایک خاکروب، دو نوجوان، نو ملازم ہیلتھ وزیٹر ——— انسانی تہذیب کے لارجے بھی آ رہے تھے۔ وہ لوگ اس گڑھے میں لال دوائی پھینک کر تمام جراثیم ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرے مخرد کو مار ڈالنا چاہتے ہو۔ میری خالدہ کو زہر دینے آئے ہو . . . . لاؤ تمہارا کام میں آسان کئے دیتا ہوں۔ میں ملیریا کے تمام اڈوں سے واقف ہوں اور پختہ پل کے قصبے میں جراثیم کو تباہ کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی بھی آپ کا ممد و معاون ثابت نہ ہوگا۔

نوجوان ہیلتھ وزیٹر نے پرشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بالآخر اس نے تمام دوائی میرے ہاتھ میں دے دی کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی اسے تمام گڑھوں میں پھینک کر ان لاروں کا خاتمہ کر دیا کروں گا۔ میں نے ان سب کو یقین دلایا، جس کے بعد وہ چلے گئے اور میں نے وہ لال دوائی واٹر ورکس کی بیس ہزار گیلن والی ٹنکی میں پھنکوا دی۔

میں حسب دستور ہریکے کی طرف سے آنے والی سڑک کے پاس پل پر ٹانگیں

ٹکاتے اس گڑھے کے قریب بیٹھا تھا اور مچھر میرے سر پہ سریلی تانیں الاپتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا وہ بے بضاعت پتنگے اپنی بھاشا میں کیا اور کون سا راگ الاپ رہے تھے، شاید وہ کہہ رہے تھے، اے اللہ کے نیک بندے! تو نے ہماری اولاد کی خبر گیری کی ہے، ہم تیری اولاد کی خبرگیری کریں گے، اور انہیں جلد ہی اس دنیا کے جیل خانے سے نجات حاصل کروا دیں گے یعنی ملیریا کے سب سے زیادہ تندرست جراثیم فخر و ادر خالد کے جسم میں داخل کریں گے۔ میں نے جواباً کہا اے میرے عزیز مچھرو ——— ! میں نے تمہاری اولاد کو بچا کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ایک معمولی انسانی فرض ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے شروع میں چھاؤنی کے ہیڈ کوارٹرز ڈلہوزی جا چکے تھے اور انگریزی رجمنٹ کے بھی نصف سے زیادہ سپاہی ڈگشائی اور لونڈ ٹوپا پہنچ گئے تھے۔ ان دنوں ننھے بھورے کا بے کار ٹٹو سارا دن عثمان پر بندھا رہتا اور ہر روز دوپہر ایک بجے کے قریب زور زور سے ہنہنایا کرتا۔ شاید وہ اس ایذا رساں مندرے والے جوئے کو یاد کرتا تھا جو کہ چند دنوں سے اس کے کندھے پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ ننھے بھورے کا ٹٹو ان بیکاری کے دنوں میں یا تو کثرت سے پیشاب کیا کرتا یا اپنی پچھاڑی سے لید کو چاروں طرف بکھیر دیتا۔ اس کے علاوہ اسے عزیزہ کی دونوں بکریوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان بکریوں کے نام گنگی اور جمنی تھے اور انہیں عزیزہ غازی آباد سے جہیز میں لائی تھی۔ جب گنگی اور جمنی اپنے گلے کے گھنگروؤں کو بجاتی ہوئی سبک رفتاری سے ساتھ اس کے پاس سے گزرتیں تو وہ اپنی ٹانگوں کو ہوا میں اچھالنے لگتا اور رسّا تڑانے لگتا۔ وہ اپنے جسم کو گزند پہنچانے والی مکھیوں کی بجائے بے ضرر بکریوں کو اپنا دشمن سمجھ لیتا۔ ٹانگیں ہوا میں اچھالنے سے بکھری ہوئی لید میں بسنے والے

تمام مچھر اڑنے لگتے اور گھبرو خاکروب ان مچھروں کو بھگانے کے لیے فوراً املتاس اور شیشم کے سوکھے ہوئے پتوں میں آگ لگا کر گہرا دھواں پیدا کر دیتا۔ پیشاب اور لید کے تعفن، مچھروں کی گھوں گھوں اور دھوئیں کی کثافت سے عزیزہ کا دل اور بھی ڈوبنے لگتا۔

جب بارش کے خدا نے میری عرضداشت مسترد کر دی اور گڑھا زیادہ سوکھ گیا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے پچاسی بنگلہ کے مالی سے گینتی مانگی اور نیچے بھورے سے ٹٹو کی ناند سے لے کر اس گڑھے تک ایک نالی بنائی اور صاف اور تازہ پانی کو نالی میں انڈیل دیا...... گڑھا پھر لبالب بھر گیا۔ میں پھر شام کو تاڑی لے کر گڑھے کے پاس جا بیٹھا اور کھانستے ہوئے ان کی تمام نقل و حرکت کا اندازہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس تازہ اور شفاف پانی نے ایک ہی دن میں لاروے کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ ذھاب کے کناروں سے جدا نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں وہ پہلی سی چستی اور کھلنڈرا پن رہا ہے۔

ان دنوں آنریری مجسٹریٹ کشمیر جا رہا تھا اور اس کی چھوٹی بیوی مومی، عزیزہ کو بطور رفیقہ کے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں حقیقت حال سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ عزیزہ کو بطور خادمہ کے ساتھ رکھنا چاہتی ہے لیکن میں اس بات کے لئے فوراً رضامند ہو گیا محض اسی وجہ سے کہ وہ خواب جن کی تکمیل میں ابھی تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکا اپنی عزیزہ کی زندگی میں پورے ہوتے ہوئے دیکھ لوں اس کے علاوہ خنک ہوا اور مصفا پانی میسر آنے سے عزیزہ کی صحت بھی اچھی ہو جائے گی۔ صرف راستے کے اونچ نیچ کی وجہ سے اس کا دل ڈوبنے کا احتمال تھا لیکن مجسٹریٹ کی اپنی کار تھی۔

مجھے یقین دلایا گیا کہ وہ لوگ اسے برش کا نام دیتے [illegible] کشمیر سے ہوتی گئے [illegible] سے ابھی۔ ناگن کی سی خوشی میں لگی اور جمنی دونوں کو [illegible] دوران [illegible] سے عزیز و کے [illegible] پر بیٹھے تھے اور ایک کمبل خرید لیا اور ان دونوں کے ساتھ اسے کشمیر روانہ کر دیا۔

پھر جیسے لوگ جو اپنے [illegible] سے یقینت گھوڑا [illegible] خوش [illegible] پاتے جلتے ہیں، قدرت بھی انہیں [illegible] گڑھوں سے پرے جانے کی [illegible] . . .

اس وقت جبکہ عزیز کشمیر کی [illegible] ہو [illegible] میں کم [illegible] ترتیب [illegible] ہوں گا۔ کہاسے وقت کا بیشتر حصہ اس گڑھے کے پاس [illegible] تھا [illegible] کی وجہ سے بیٹھا جا بیٹھا مرچکے تھے۔ [illegible] بنگلے کے مالی نے مجھے بتایا کہ پانی کے پاس اور گندے ہو جانے سے اور [illegible] پیدا ہو جاتے ہیں [illegible] پہلی سی چستی ہو کر آ [illegible] کو کا پیشاب [illegible] سے گڑھے میں آنے لگا۔ . . . . . .

اور ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے پھر مینڈکوں کو پانی میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے مخصوص لمبے ڈھنگے انداز سے تیرتے ہوئے دیکھا۔ پانی کے باسی اور پیشاب وغیرہ کی وجہ سے گندے ہو جانے سے گڑھے میں پھر ایک بار رونق پیدا ہو گئی۔ اور میں ایک گونہ طمانیت کھاٹ پہ لیٹ کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

دھوپ اتنی تیز ہو چکی تھی اور [illegible] اس آفت کا تھا کہ [illegible] گیا سارا ارتھ کھمبوں سے بھر گیا۔ لیکن اس دن سے میں نے کبھی آسمان کی طرف بارش کے لئے نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ [illegible]

ہلاک ہو جائیں گے اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلودہ اور باسی نہ ہوگا مزید لاروے وجود میں نہیں آئیں گے۔

چوماسے کے دوسرے دن بڑی موسلادھار بارش ہوئی۔ اس وقت میں تن تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا اپنا پھٹا ہوا پاجامہ سی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لالہ کا دو ماہ کا بل کیسے ادا ہوگا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے فوراً اٹھ کر دروازہ کھولا میرے سامنے تار کا ہرکارہ تھا۔ عمر تیس پینتیس برس کے قریب ہوگی۔ چہرے کے سیاہ رنگ میں سے دو سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ اس کی خاکی وردی تمام بارش میں بھیگ چکی تھی اور پانی کے قطرے اس کی کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے داڑھی کے بالوں سے قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔ ایک انگلی سے چہرہ پونچھنے کے بعد اس نے خاکی بلوز کے نیچے سے ایک بھیگا ہوا لفافہ نکالا اور بولا "میاں عزیزالدین ٹھیکیدار کے مختار آپ ہیں؟"

میں نے بغیر جواب دیئے اس بھیگے ہوئے لفافے کو ہاتھ میں لے کر کھولا تار پرتیم داس کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا "عزیزہ کو پہاڑ کا تندرست پانی راس نہ آیا۔ اسے کل ہل ڈائریا (پہاڑی پیچش) کی شکایت ہوئی اور آج اچانک صبح کے سات بجے وہ مر گئی۔ چونکہ تمہارا ایک دن میں پہنچنا مشکل ہے اس لئے میں ڈاکٹر کی سند لے کر اسے دفنا رہا ہوں۔ اپنی رضامندی بذریعہ تار بھیجو۔"

میرے دماغ نے اس حادثے کی اطلاع کو قبول نہ کیا۔ میں نے فقط دروازے تک پہنچتے ہوئے اتنا کہا "اسے خدا تو اپنی بارش کو تھام لے۔"

گھر میں بازار میں

دیوار پر لٹکے ہوئے ٹیکوشا نے صبح کے آٹھ بجا دیئے۔ درشی نے آنکھ کھولی اور ایک سوالیہ نگاہ سے سنتے، آبنوسی کلاک کی طرف دیکھا جس کی آٹھ ضربیں اس کے ذہن میں گونج پیدا کرتی ہوئی ہر لحظہ مدھم ہو رہی تھیں...... ایک گھٹیا سا قالین تھا اور یہی ایک کلاک جو درشی کے استاد نے اسے شادی کے موقعہ پر بطور تحفہ دیا تھا شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی شاگرد ایک اچھی بیٹی ہونے کے علاوہ ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو جائے...... اور ہر روز صبح ٹیکوشا اپنے مستقل طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا کہہ دیتا۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن اب تو آٹھ بج گئے ہیں اٹھو سست لڑکی!"

درشی کا پورا نام تھا پریہ درشنی۔ پریہ کا مطلب ہے پیاری اور درشنی کا مطلب ہے

۔۔۔۔۔ دکھائی دینے والی نہیں جو دیکھنے میں پیاری لگے، دل کو لبھاتے، آنکھوں میں نشہ پیدا کرے۔ ۔۔۔۔۔ شاید انہیں سنتے درشی کو رات بھر جاگنا پڑتا تھا اور شیکو شا سے نظر بچا بچا کر نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ درشی بچپن ہی سے عصبی صلاحیت اور ضرورت سے زیادہ حساس تھی اور اب شادی کے بعد محبت کی نئی عنایتوں سے وہ نسوں کی اور بھی کمزور ہو گئی۔

سسرال میں چند دنوں کے بعد تو سب سے بڑی دقت درشی کو پیش آئی۔ وہ اپنے خاوند رتن لال سے پیسے مانگنا تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے باپ سے بلا تامل پیسے مانگ لیا کرتی تھی اور اگر کبھی وہ اپنے معمول کے کام میں چوک بھی جاتے تو درشی ان کی لاڈلی بیٹی ان کے کوٹ کی جیب میں سے ضرورت کے مطابق نکال لیا کرتی۔ پاپا کا کوٹ ہمیشہ زنانے میں کسی بڑی کھونٹی کے اوپر لٹکا ہوا مل جاتا تھا۔ اپنے میکے سے جتنے پیسے وہ ساتھ لائی تھی۔ وہ سب اگنس کے پیسوں سمیت ایک خوبصورت طلائی گھڑی پر ختم ہو چکے تھے۔ خرچ کی یہ تنگی وہ رتن سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ رتن سے ضرورت کے مطابق پیسے مانگتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ جب ان کی ضرورتوں کا خیال ہوگا، تب وہ پیسے مانگ لے گی۔ ہر صورت میں وہ پیسے مانگ کر بکنا نہیں چاہتی تھی۔

کئی دفعہ بازار میں کسی چیز کی خرید ہوتی تو درشی اپنی پتلی پتلی نازک کامنی سی انگلیاں اپنے شوہر کے خوبصورت لیکن خالی بٹوے میں ڈال دیتی اور کہتی ۔۔۔۔۔

"چھوڑیئے ارجن دیجئے ۔۔۔۔۔ پیسے میں دوں گی"

رتن لال اسی وقت درشی کا ہاتھ تھام لیتا اور بسیار میں سے نظر بچاتا ہوا محبت

کے انداز سے درشی کی طرف دیکھتا اور کہتا۔

"ایک ہی بات تو ہے، درشی"

اس وقت درشی محبت کی ایک پُرلطیف ٹیس محسوس کرتے ہوئے چپ ہو جاتی۔ اسے یقین تھا کہ رتن کبھی بھی اسے پیسے ادا کرنے نہیں دے گا۔ کیا وہ اس کی بیوی نہیں ہے؟ آخر کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ خود ہی اس کے تمام چھوٹے موٹے خرچوں کا کفیل ہو؟

ان دنوں برسات شروع تھی اور رتن کا برساتی کوٹ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ بارش کے قطرے اس میں کسی نہ کسی طرح گھس ہی آتے تھے۔ اسے خریدنے کے لئے درشی اور رتن بازار گئے۔ موسٹیکا سٹور میں انہیں ایک اچھا سا کوٹ مل گیا۔ قیمت طے ہونے سے پہلے درشی نے حسب دستور بیگ کے بٹن کھول دیئے اور بولی "پیسے میں ادا کیے دیتی ہوں، رہنے دیجئے"

رتن لال نے اپنے ہاتھوں میں دس کا نوٹ مسلتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تمہارے پاس ریزگاری ہو گی؟"

درشی گھبرا گئی۔ اس کی نگاہیں کاؤنٹر پر جم گئیں۔ اس نے یونہی کچھ دیر تک بیگ کو ٹٹولا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ! بھول گئی میں —— ریزگاری تو میرے پاس بھی نہیں۔"

رتن لال نے اسی اثناء میں انگلی کے گرد نوٹ کو بہت سے چکر دے ڈالے تھے اور عصبی طور پر کمزور درشی خاموش رہنے کی بجائے کہنے لگی "ریزگاری تو گھر ہی رہ گئی —— میرے پاس تو پچاس یا پانچ کے نوٹ ہوں گے۔"

درشی نے غالباً یہی سمجھا کہ رتن لال پھر ایک دفعہ میٹھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر پیسوں کی ادائیگی کا سوال ہی نہیں اٹھے گا۔ لیکن وہ یہ بھول ہی گئی کہ شادی کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اب تکلف کی چنداں بات نہیں رہی۔ رتن نے کوٹ کو اتارتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا! پانچ پانچ کے دو نوٹ ہی دے دو، یہ لو اور رکھ لو دس کا نوٹ۔"

اس وقت درشی کے کان گرم ہو گئے، جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے بلا وجہ برساتی کو اِدھر اُدھر الٹانا شروع کر دیا۔ برساتی کے ایک کنارے پر سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں اسے نجات کی راہ دکھائی دی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے نہایت خشمگیں انداز سے کہا۔

"یہ تو پھٹی ہوئی ہے ——— کوڑی کام کی نہیں یہ۔"

اور پھر دکاندار کو مخاطب ہوتے اسی لہجے میں بولی "بھلا آپ نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے جی! جو پھٹا وا کوٹ ہمیں مڑھ رہے ہیں؟"

سیلز مین بالکل گھبرا گیا اور فوراً نئے کوٹ لینے کے لئے دکان کے اوپر چلا گیا۔ درشی کی برہمی کی وجہ سے رتن بھی سہم گیا اور ایک مصنوعی غصے سے دکاندار کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت درشی نے رتن کو بازو سے پکڑا اور باہر لے آئی۔ سامنے سیڑھی پر سیلز مین برساتیوں کے بوجھ سے لدا ہوا سٹاک روم سے نیچے اتر رہا تھا۔ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ حسین جوڑا نظروں سے غائب ہو چکا تھا...

رتن نے دیکھا درشی کے منہ پر سیاہی ابھر گئی تھی اور ماتھے پر ایک بڑے سے قرمزی دھبے میں سے پسینہ کے قطرے بے تحاشہ اُمڈ رہے تھے۔ بازار سے لے کر

گرہن

گھر تک اس کی بیوی لکنت بھری باتیں کرتی رہی ——— اور رتن اس کی ایک بات کا بھی مطلب نہ سمجھا اور جب اس نے تانگے پر سے ہاتھ دے کر درشی کو اتارا تو اسے معلوم ہوا کہ درشی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے . . . . اور چونکہ وہ عورت کے سیدھے سادے تنفس کی ایک کڑی کھو بیٹھا۔ اس نے مرد کی دیرینہ عادت کے مطابق کہنا شروع کیا ——— عورت ایک معمّا ہے۔ شوپنہار کہتا تھا . . . .

اگلے دن درشی سو کر اٹھی تو آٹھ کی بجائے آٹھ پینتیس ہو چکے تھے اور سورج ان کے دریچہ پر آ گیا تھا۔ اس کی شعاعیں کلاک کے شیشے میں سے منعکس ہوتی ہوئی درشی کے چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔ کلاک کے بڑے بڑے روشن ہندسوں کی خالی سفید جگہ بڑے بڑے دانت بن گئی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے شنیچر شاطر کی حد سے گزر چکا ہے اور کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔

. . . . اور شکوہ شکایت ہی نہ تھا۔ اس کے ساتھ لگو کی ماں بھی تو شریک ہو گئی تھی۔ لگو کی ماں رتن کے ہاں ملازم تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ جب تیج پر وہ رونے لے کر آئی تو رانی جی کو یوں تکتے تکتے دیکھ کر ہنسی تھی . . . . غم خوار کے انداز سے ہنسنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو ہم بھی بہت دن شکنیں گزرتے تھے۔ ہماری آنکھوں میں بھی خمار ہوتا تھا اور اب تو راتوں کو جگانے والے بھگوان نے دوار سے ہی چھین لیے آہ! مجھے وہ دن یاد ہے جب میرے جھٹکے کے لئے بہت شد رکھا اور کنگھی ہاتھ تھے . . ——— اگلے دن تو وہ جیسے اندر آنے میں آنے۔ دروازے پر ہی کھڑے کراتے تھے

اور جب اندر آتے تو ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا اور وہ گوٹا دیکھ کر میری سب تھکان اتر گئی تھی۔

درشی نے چلاتے ہوئے کہا "گگو کی ماں!"

گگو کی ماں کے لبوں پر تبسم نہیں رہا۔ صرف اس کا سایہ رہ گیا، ہلکی سی سرخی سے اس کا رنگ سپیدی اور سپیدی سے زردی اور سیاہی مائل ہو گیا اور وہ حیرت سے کلاک کی ٹِک ٹِک کو سننے لگی۔ درشی کے لئے وہ معمولی ٹِک ٹِک ہتھوڑے کی ضربوں سے کم نہ تھی۔ استاد کی صورت ملونا خاطر نہ ہوتی تو وہ پتھر مار کر اس کی ٹِک ٹِک کو روک دیتی...... گگو کی ماں سوچ رہی تھی کہ آخر مالکن کیوں خفا ہو رہی ہے حالانکہ رتن بابو نے اسے ایک نئی ساڑی خرید کر لا دی ہے جس پر پورا ایک ہاتھ چوڑا طلائی بارڈر لگا ہے اور اس کے اندازے کے مطابق اس کی تمام تھکاوٹ دور کر دینے کے لئے کافی ہے۔

درشی نے کہا "آج پھر تو نے مجھے بنا چائے کے پانی میں وہ وعدی کا گڑ ڈال دی!"

گگو کی ماں نے سنبھلتے ہوئے کہا "رتن بابو نے کہا تھا۔ رانی۔"

"کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"کہا تھا ——— رانی بیمار ہے۔"

گگو کی ماں نے ڈرتے اٹھائی۔ وہ گھورا ہتے ایک ہاتھ چوڑے طلائی بارڈر کو کھینچتی اور دل ہی دل میں گنگوؤں کو گستی ہوئی چلی گئی۔ درشی سوچنے لگی کیا رتن کو اس کی ناراضگی کا پتہ چل گیا ہے؟ اسی لئے تو وہ اس قسم کی چائے کو میرے لئے غیر مفید سمجھنے لگے ہیں اور کیا معلوم جو اس نے سوچتے ہیں بہت چائے کی عادی بھی ہیں۔ اس نے

زنانے سے ایک ہاتھ سرہانے کے نیچے مارا۔ بیگ موجود تھا اور شاید جوں کا توں بند۔
———— بیگ کے ایک کونے میں جھومروں کی ایک جوڑی پڑی تھی درشی جھومروں کی بہت شوقین تھی۔ لیکن اس کے بیاہ میں جتنے بھی زیور دیئے گئے تھے وہ سب کے سب وزنی تھے اور دیہاتی طرز کے بنے ہوئے۔ اکیلے جھومر ہی ڈیڑھ تولہ کے تھے۔ درشی جانتی تھی۔ کہ رتن ان جیسے جھومروں کو پہنے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ خود بھی رتن کو خوش رکھنا چاہتی تھی لیکن اس بات کا کیا علاج کہ وزنی جھومر پہننے سے اسے اپنے کان ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ انہیں نصف گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہیں پہن سکتی تھی۔

پر یہ درشی کی خواہش تھی کہ وہ ہلکے سے جھومر خرید لیتی۔ یہی کوئی سستی سی جوڑی۔ لیکن ان کے لئے وہ رتن سے پیسے نہ مانگے گی۔ تاوقتیکہ وہ خود اپنے فرض کو محسوس کرتا ہوا پیسے اس کے ہاتھ میں نہ دے دے۔

معاً اس کا خیال پاپا کی طرف چلا گیا۔ ان سے تو وہ پیسے لڑ کر بھی مانگ لیتی تھی۔ کسی خیال کے آنے سے درشی اٹھی اور اپنے ہی کمرے میں جب اس نے الماری کھولی تو اس کی چار جیٹ کی ساڑی کے اوپر رتن کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔۔۔۔۔ درشی کے منہ پر ایک سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا تمام مرد ایک ہی سے نابینا ہوتے ہیں۔ یہی مردوں کا تجربہ ہے اور پھر زنانے میں میلی کوٹ یا چار جیٹ کی ساڑی کے اوپر اپنا کوٹ شاید عمداً بھول جانے کا کیا یہ مطلب نہیں کہ اس کوٹ کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھا جائے، کیا جائے گویا کوٹ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو "میں نے تجھے مسل ڈالا ہے تو اس کے عوض تیا میری جیبیں کاٹ ڈال" درشی نے دروازے پر نظر

گاڑ ے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں دس دس کے چار نوٹ اور کچھ ریزگاری آ گئی۔ اس نے سوچا اگر وہ اس میں سے ضرورت کے مطابق کچھ اڑا لے تو رتن کیا کہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوری تو ایک ذلیل حرکت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تو روحوں کا ملاپ نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ یوں جیب میں سے پیسے اڑا کر میوا نہ کہلائے گی ؟

دو تین دن تک درشی کو ہری پال پور اپنے مریضوں سے بذریعہ تار سو روپے آ چکے تھے ٹیگس کے اور روپے اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے بہت حد تک درشی کی عصبی کمزوری کو آرام پہنچایا۔ گگو کی ماں بھی خوش تھی اور بھگو ان کو کم یاد کرتی تھی۔ درشی نے کئی مرتبہ رتن کو کہا کہ بازار جا کر برساتی کوٹ خرید لینا چاہئے۔ برسات کے بعد اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ لیکن چند دنوں سے رتن لال اپنے دفتر میں اسمبلی کے لئے ہندسے تیار کر رہا تھا اور اس کے لئے اسے بارش، دھوپ، سارڑی کسی چیز کی پروا نہ تھی اور اس بات نے درشی کو بہت غمگین کر دیا تھا۔

ایک شام رتن گھر واپس آیا تو درشی کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ اس کے ہاتھ میں جھومروں کی ایک جوڑی تھی۔ جو قیمتی بھی بہت تھی اور جدید فیشن کی۔ درشی خوش نہیں ہوئی کیونکہ وہ جھومر اس نے خود نہیں خریدے تھے۔ رتن نے انہیں اپنی خاطر خریدا تھا۔ وہ خود بھی تو اسے جھومر پہنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد کبھی بھی عورت کی فرمائش پر زیور خریدنا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنے لئے سجانے کو خریدتے ہیں۔ درشی کو تسکین ہوتی بھی تو محض اس لئے کہ رتن انہیں خود بخود خرید لایا اور ایسا

کرنے میں اس نے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا۔

جھومروں کی جوڑی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ طنزیہ انداز سے بولی۔

"ختم ہو گئے آپ کے ہندسے؟"

"ختم ہو گئے۔"

رتن نے درشی کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکے سے چھڑا لیا۔ بولی "اب میرے ہندسے شروع ہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں کم سے کم تین بھتیجوں کے سوئیٹر بننے ہیں۔"

رتن نے پھر ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "تو کیا تمہیں جھومر پسند نہیں؟"

"جھومر؟ ——— اوہ! ہاں" درشی منہ پھلاتے ہوئے بولی "آپ نے بہت تکلیف کی۔"

شیکو شاید سنور مسکرا رہا تھا۔ وہ محض ایک کلاک ہی نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے متواتر ٹک ٹک ٹک ٹک کرنے والا۔ وہ درشی کا ہستہ دلی تھا جس کے ڈائل اور سوئیوں نے درشی کو ایک اچھی لڑکی کے طور پر دیکھا تھا اور اب شاید ایک اچھی بیوی کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

رتن بھی گھڑی کھو دینے سے منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا۔ وہ درشی کے باتوں میں طنز نہ پا سکا تو وہ بولی۔

"آپ تو یونہی میرے لئے پیسے برباد کرتے ہیں ——— بھلا اور بھی کوئی ایسے کرتا ہے؟"

رتن پھٹی پھٹی آنکھوں سے درشی کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر درشی اسی وقت وہ جھومر اپنے کانوں میں نہ ڈال لیتی تو دنیا کی تاریخ کسی اور ہی ڈھب

سے لکھی جاتی۔ اس نے نہ صرف جھومر پہنے بلکہ اپنی گردن کو عجب انداز سے اِدھر اُدھر ہلا دیا اور رتن ایک ایماندار آدمی کی طرح اس کی گردن اور اس کے ہلتے ہوئے جھومروں کے متعلق سوچنے لگا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی تک درشی کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ بولی۔

"کیا لاگت آئی ہے اس پہ؟"

"کوئی بہت نہیں"

"تو بھی"

"ساڑھے اکتیس روپے"

درشی نے اپنے صابر کے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ رتن ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گیا۔ وہ شاید اس بات کو مذاق سمجھ کر جانے دیتا لیکن درشی کے چہرے نے اسے مذاق کی حدود سے بلند و بالا اٹھا دیا تھا...... کچھ دیر بعد رتن نے اندھیرے میں اپنے پاؤں تلے زمین محسوس کی۔ گویا کوئی کھوئی ہوئی گڑی اس کے ہاتھ آ گئی ہو۔ اس نے اپنی جیب میں سے تمام نقدی نکالی اور اندھیرے میں درشی کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا "تم اس دن اپنی کسی ضرورت کا ذکر کر رہی تھیں ——— لو یہ اپنی مرضی سے خرچ کر لینا"

درشی نے ایک ثانیہ کے لئے سوچا۔ رتن نے ایسا کرنے میں عورت کو سب سے بڑی گالی دی ہے ——— "بیسوا!"

بیاہ کو ایک دو سال گزر گئے لیکن دونوں کی زندگی میں کوئی خاص بالیدگی

نہیں آئی۔ بلکہ رتن اب کچھ کچھ کھا پی سا ربننے لگا۔ اس عرصہ میں درشی بیوی کے تمام ہنر سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ سگھڑ و سلیقہ مند تھی۔ آج تک اس نے کبھی بیدولی رتن سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ وہ بیاہ والی اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو کوسا کرتی۔ مثلاً یوں ہوتا کہ بچے کے فراک یا اسے سلیشیم دینے کا ذکر ہوتا تو وہ فوراً بھول جاتی اور پھر رتن اس کی ضرورت اور اپنے شوق سے متاثر ہو کر خود ہی اسے کچھ نہ کچھ لا دیا کرتا۔ ہری پال پور میں آنا جانا بنا ہی ہوا تھا۔ اگرچہ درشی کی ماں سوتیلی تھی۔ باپ تو سوتیلا نہیں تھا۔ بڑا بھائی بھگو بھیا بختیہ ہو چکا تھا اور چھوٹا دفتر اور ہندسوں کے بعد رتن کا کوٹ اس کے میلی کرت پر لٹکا ہوتا۔ . . . . .

اس ایک دو برس کے عرصے میں شکونتلا کا چہرہ قدرے بھر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ پہلی سی شرارت اور طنز آمیز مسکراہٹ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا کوئی پرندہ خراب ہو جاتا تو اس کی مرمت کر دی جاتی۔

ایک دن رتن لال شب کو کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا۔ صبح واپس آیا تو درشی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آج صبح میں نے ایک واقعہ دیکھا۔"

درشی نے بچے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا "کیا دیکھا ہے آپ نے؟"

رتن بولا "میں کہتا ہوں ——— یہ بازاری عورتیں کتنی بے حیا ہوتی ہیں۔ آج میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا۔ جس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ جس کی آنکھیں خمار آلودہ تھیں جسم سے بیمار دکھائی دیتی تھی صبح صبح سر بازار اس نے ایک بابو کو کالر سے پکڑا ہوا تھا اور پیسے مانگ رہی تھی۔ وہ بیچارہ کوئی

بہت ہی شریف آدمی تھا۔ وہ چیختا تھا، چلاتا تھا۔ کہتا تھا میں نے اسے ایک خوبصورت ساڑی لاکر دی ہے۔ گرگابی خرید دی ہے اور اب پیسے طلب کرتی ہے......

وہ بے غیرت بھرے بازار میں کہہ رہی تھی کہ وہ تو سب حسن کی نیاز ہے اس نے اپنے لئے مجھے وہ ساڑی پہنوائی تھی۔ اپنے لئے گرگابی جسے پہن کر میں اس کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو گئی لیکن مجھے پیسے چاہئیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے مجھے اپنے بچے کے لئے کپڑے سینا ہیں؛ میں نے کرایہ دینا ہے، مجھے پوڈر کی ضرورت ہے......"

اور اس کے بعد رتن ہنسنے لگا۔ بے معنی، بے مطلب ہنسی' اور اس عرصہ میں اپنا سلوٹوں سے بھرا ہوا گال چھپاتا رہا۔ اس بات کو سن کر درشی کی ساری طبعی کمزوری واپس آگئی۔ درشی نے محسوس کیا اس میں جتنی کمزوریاں تھیں وہ میسو امیں مفقود تھیں۔ وہ اس کے جسم کا بقیہ حصہ تھی جسے اپنے آپ میں محسوس کرتے ہوئے وہ ایک مکمل عورت ہو گئی تھی درشی نے سر سے پاؤں تک شعلہ بنتے ہوئے کہا۔

"وہ بابو پاجی آدمی ہے ـــــ کمینہ ہے..... اور وہ میسو اکسی گرہستن سے کیا بری ہے؟"

رتن لال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے درشی کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا مطلب ہے ـــــ اس جگہ اور اس جگہ میں کوئی فرق نہیں؟"

درشی نے اسی طرح بپھرے ہوئے کہا" فرق کیوں نہیں... یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے"

ـــــ کلاک کی ٹک ٹک بند ہو گئی۔ رتن لال سوچنے لگا" عورت سچ مچ ایک معمّا ہے اور شو بہار نے.......!"

دُوسرا کنارہ

(ناول سے ملخص)

کھاڑی کے اس کنارے، ڈہوک عبدالاحد کے ایک سنگلاخ ٹیلے پر کھڑے ہونے سے، دوسرا کنارہ بہت دور، ایک دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ دوسرے کنارے پر اور اس سے پرے کیا ہے، اس کے متعلق ہم تینوں بھائیوں میں سے ایک بھی نہ جانتا تھا۔ اس پار، اجاڑ نگاہ سے دور، ایک نقرئی سی لکیر سورج کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو کہ فوراً ہی دھند کی لطیف چلمن کے پیچھے غائب ہو جاتی وہ لکیر غالباً پانی کی ایک ندی تھی جو کہ ڈہوک عبدالاحد کے شمال میں کھاڑی سے علیحدہ ہو کر دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ بہ رہی تھی۔

دوسرا کنارہ ہمیشہ پراسرار ہوتا ہے اور انسان کا مطمح نظر۔ انسان ہمیشہ پہنچ سے باہر چیز کا مشتاق ہے۔ اس کی زندگی کے بہت سے رومان کا فلسفہ بھی یہی ہے . . . .

گرہن

زندگی کے دوسرے کنارے پر کیا ہے؟ یہ زید جانتا ہے نہ بکر۔ راستے میں موت حائل ہے۔ اور ڈھوک عبدالاحمد کے قصبے میں کھڑے ہو کر دکھائی دینے والے دوسرے کنارے پر کیا تھا؟ ہم نہیں جانتے تھے۔ راستے میں موت کی سی ذخار کھاڑی حائل تھی۔

حق تو یہ ہے کہ اسی کھاڑی نے ہماری محنت کش، نزع کی سی زندگی میں رومان پیدا کر دیا تھا اور ہمارے تصور میں ایک ہلکی سی رنگ آمیزی ہو گئی تھی۔ اس خوب صورت نیلی بطخ کی مانند جو سفید براق کفن کی تہوں میں دکھائی دیتی ہے بسا اوقات جب میں بیکری کے دوزخ نما چولھے میں سے آخری ڈبل روٹی نکالتا تو فوراً ڈھوک کے سنگلاخ ٹیلے پر جا کھڑا ہوتا۔ اور مستفسرانہ نگاہوں سے فیری بوٹ میں سے اترنے والے مسافروں کے رنگ ڈھب، چال ڈھال اور وضع قطع کا معائنہ کرتا۔

کبھی کبھی قصبے کے بنگلوں کے بڑے مرغی خانوں کے لئے دوسرے کنارے کی طرف سے بڑے بڑے لیگ ہارن نژاد مرغ دیسی مرغیوں سے جفت کرنے کے لئے منگوائے جاتے اور یہاں سے بڑے بڑے ونفی انڈے اس پار لے جانے کے لئے ٹوکریوں میں بند کئے جاتے۔ ہماری بیکری کی روٹیاں بھی اسی فیری بوٹ میں لے جائی جاتی تھیں۔ ہمارے باپ نے فیری کے مالک سے سال بھر کا ٹھیکہ کر رکھا تھا۔ وہ خود کئی دفعہ دوسرے کنارے پر گئے تھے اور اکثر اس پار کے دلچسپ قصے ہمیں سنایا کرتے تھے۔

ایک دن میں چولھے کے پاس بیٹھا پسینہ میں شرابور، خمیرے آٹے کی ٹکیاں بنا رہا تھا۔ تو سندر، میرا بڑا بھائی آیا۔ وہ غمگین سا دکھائی دیتا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے قریب پڑا ہوا پانی کا ایک گلاس اٹھایا اور پی گیا۔ پھر سنگتروں کے سوکھے ہوئے چھلکے اٹھائے اور کسی گہری سوچ میں مستغرق، ان چھلکوں کو خمیری ٹکیوں پر

چپکانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد میرے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

"تحصیلدار آیا ہے۔ نیا تحصیلدار۔۔۔۔۔"

میں زیادہ تیزی سے ٹکیاں تھاپنے لگا۔ خمیرے آٹے کے ایک ٹکڑے کو میں نے ہوا میں اچھالا۔ وہ گول گول چکر کاٹتا ہوا میرے ہاتھوں میں گرا۔ یہ میں اس لئے کیا کرتا تھا کہ میرے دوزخی کام میں کچھ دلچسپی پیدا ہو جائے لیکن کیا اس سے بکری کے گوبر کی تمازت کم ہو جاتی ہے اور آگ میرے لئے اپنی حرارت کو خیر باد کہہ دیتی تھی؟

جب میں نے سندر کی بات کو سنا تو اس نے جھک کر میرے قریب سر کیا اور میرے کندھے کو چھوتے ہوئے بولا:

"تم نے سنا، تحصیلدار آیا ہے۔"

میں نے جھلا کر سندر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تو پھر بہت سی روٹیاں درکار ہوں گی۔۔۔۔ ہے نا؟"

سندر نے اپنے بازو اوپر اٹھاتے قمیص کو اتار کر بہت دور گھاٹ پر پھینک دیا اور دو تین جھبری روٹیوں پر سنگترے کا چھلکا چپکاتے ہوئے بولا:

"رگھو۔۔۔۔ تم نہیں جانتے گھو کو؟ وہ نیل انگوٹھیا بار تھا۔ اب اسے ملو تو کہنا۔ وہ اب خان صاحب اکرم الدین ہو چکا ہے۔۔۔۔ اور وہ گھوک ہی میں تحصیلدار ہو کر آیا ہے۔ پچھ سال ہوئے وہ گھاٹی کے پاس مر دن گیا تھا۔۔۔۔"

میں نے اسی رفتار سے خمیرے آٹے کو تھاپنا چھوڑ دیا اور جھبرائے سندر کی باتوں کو سننے لگا۔۔۔۔ بہت سی باتیں سنانے کے بعد سندر اپنے ہی مخیز سے انداز میں گے چھلکے اکٹھے کرنے لگا۔ سندر کی باتوں میں کچھ خلش تھی، اور اضطراب۔۔۔۔ غم اور

خواں صاحب علیم الدین ہو چکا ہے اور سندر ابھی وہیں بھاڑ جھونک رہا ہے۔ اس بات میں بیکری کی آگ سے زیادہ جلن تھی، سندر کے لئے ....

دو تین دن تک سندر بہت خاموش رہا۔ جب وہ بھاڑ کے قریب جھک کر لوہے کے چپٹے سے چپکی ہوئی خمیری روٹی کو نکالتا تو کچھ سوچ میں غرق ہو جاتا ......

ایک دن بہت سی ٹکیاں جل گئیں، اس دن ہمارا باپ بہت غصہ ہوا اور اس نے ایک پتلی سی بینت کی چھڑی سے سندر کو پیٹ ڈالا وہ بینت کی چھڑی اسی مطلب کے لئے پانی میں بھگوئی جاتی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ عبرت ناک سزا دی جا سکے۔ باپ کے برابر کا ہونے کے باوجود سندر ہمیشہ اس مار کو خاموشی سے سہہ لیا کرتا تھا۔ باپو سندر کو مارتا تھا، وہ رکتا نہ تھا۔

"بڑا تحصیلدار بنا پھرتا ہے ——— حرامکار۔"

اس وقت ہم دونوں، تینوں بھائیوں کی نگاہیں اس پار چلی جاتیں، جہاں سے تحصیلدار بن کر آتے تھے، جہاں دن میں مشکل سے دس درجن روٹیاں بنانے والا بیکری کا مالک ہمیں مسیحے کا اہل نہیں تھا لیکن جب ہم تحصیلدار نہ بنتے تو ہمیں پیٹا کرتا اور بال بھی نوچ لیتا۔ ہمارے زخموں کو سینکتا اور پھر مار کر زخمی کر دیتا ......

ہم بچپن سے سنتے آئے تھے کہ اس پار بڑی دولت ہے جو کوئی بھی جاتا ہے مالا مال ہو کر آتا ہے ...... وہاں، بڑے شہر میں ایک چھوٹا بستی ہے جہاں تحصیلدار بنانے کا ایک کارخانہ ہے ...... شاید اسی میں سے نکلے جاتے ہیں۔ ڈھرک عبدالاحد کا ذرد غمناک ہو نہ ہر روز ہماری روٹیوں میں نقص نکالا کرتا ہے۔ اسے بھی بھیجا گیا ہے ...... جب ہم نے نیچے سے کھڑکی کی طرف دیکھا تو ہمیں بادلوں کے نیچے سیری

آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ ان
میں سفید سفید انڈوں کے ڈھیر سے ٹیلے پر سے موتیوں کی ڈھیریوں کی مانند دکھائی دیتے تھے
اس کے علاوہ آنکھ پر ہاتھ رکھنے سے دور ایک نقرئی سی لکیر نظر آتی تھی جو کہ سورج کی
روشنی میں چمکتی ہوئی فوراً ہی ایک دھند کے پیچھے غائب ہو جاتی تھی۔۔۔۔

ہر سال پوہ ماگھ کے مہینوں میں ہمیں دسمبر کے قریب روڑیاں روزانہ ڈھونی
پڑتی تھیں۔ بہت سے سنگتروں کے چھلکے اٹھانے ہوتے۔ پان سات بوریاں میدے اور
آٹے کی اٹھوانی ہوتیں ۔۔۔ پیسے سیجن کے بعد چکا دیے جاتے تھے۔ ان مہینوں
کو باپو سیجن کے مہینے کہا کرتا تھا جس طرح استقاط اور اٹھرا کی مائیں مخصوص مہینے کو
خوف سے ان گنا گنتی ہے اسی طرح ہم سیجن کو ان گنا گنا کرتے تھے۔۔۔۔
سنتے ہیں کھاڑی کے اس پار ایک بڑے سے گھنٹہ گھر کے ارد گرد سینکڑوں ہزاروں
صاحب لوگ رہتے تھے۔ ان دنوں ان کا میلہ ہوتا تھا۔ جسے وہ لوگ کرسمس کہتے
تھے جس میں مرد عورت ننگے ہو کر ناچتے تھے۔ تب بڑا مزہ ہوتا تھا اور ۔۔۔ تب ہی
سینکڑوں روڑیاں لگانی پڑتی تھیں۔

"یہ سیجن کی بات ہے۔" باپو نے ایک دن تیرہ اور شرلی پر آتے ہی کہا "دسمبر آ رہا
فیری کے دوسرے پھیرے سے پہلے دن کی تمام روڑیاں وہاں پہنچا دی جاویں۔" ہم نے جلدی
جلدی روڑیوں کو جھاڑیوں سے نکالا اور ٹوکریوں میں ڈال کر فیری کی طرف چلے گئے۔

اس دن آسمان پر ایک مٹیالی رنگت چھائی ہوئی تھی۔ ہمیں آندھی کی توقع تھی۔
پوہ ماگھ کے مہینے میں ڈھرک جلد اکثر آندھیاں آ جاتی ہیں۔ ذرا سی تیز ہوا کے بعد

چلنے سے کھاڑی کے شمال کی طرف پڑی ہوئی سینکڑوں من ریت آسمان پر چڑھ جاتی ہے .... اس دن تند ہوا پانی میں لہروں کے جذبات پیدا کر رہی تھی کبھی کبھی ایک اچھال سی آتی اور پانی ہمارے گھٹنوں میں ٹوٹتا ہوا بہت سے گندے اور سبز جالا چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ کبھی کبھار اچھال کے ساتھ کوئی مچھلی کنارے پر رہ جاتی اور پانی کے لئے مضطرب، خشک، ریتلی زمین پر تڑپنے لگتی۔ لگ دوڑ کر اسے پکڑ لیتے۔ ورنہ ہمیں مجنون کر کہا جاتے۔

فیری دھیمے دھیمے ہنپوے کھاتے ہوئے کنارے پر آ لگی۔ اس میں سے تحصیلدار جوق در جوق اترنے لگے۔ ان لوگوں میں کچھ جان پہچان کے تھے اور کچھ ناواقف۔ وہ الجھے ہی نور بیگ کے بک تھے جو بندوق کا لائسنس بیچنے کے لئے اس پار گئے تھے۔ اس کے بعد ایک ٹرا ڈربہ اترا جس میں سے کٹک کٹک، کوکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا بیگم کے وسیع مرغی خانے کے لئے عزیز بیگ یہاں منگوائے گئے تھے۔ اس وقت بادشاہ بھی آ گیا۔ فیری کے مالک سے سال بھر کے کرائے کا فیصلہ کر رہا تھا۔

...... ہم سب کی نظریں فیری کے کونے میں بیٹھی ہوئی میم صاحب پر جم گئیں۔ اس کا حسن سب کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ میم صاحب کے سر پر ایک ہلکی سی کالے رنگ کی ٹوپی تھی۔ جسے اڑ جانے کے خوف سے اس نے مرمریں بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ مگر جس چڑی ہوئی بیٹھی اور اٹھے ہوئے گھٹنوں کی وجہ سے ہیاتی کا ابھار ایک چٹان کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ معاً میرا خیال اپنی جادجہ کی طرف چلا گیا جس کی چھاتیاں کسی مردہ ہوئے مرغ کی گردن کی طرح لٹک رہی تھیں، مندر کا بیاہ ہوتے ابھی بمشکل پانچ سال ہوئے ہوں گے کہ تین بچوں کی پیدائش نے ہماری کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔

.... اور میم صاحب نے ایک ریشمی چھینٹ کا گون پہن رکھا تھا جو
کہ اس کے جسم کے تمام اعضاء کی وضاحت کر رہا تھا۔ ننگے بازو ڈبل روٹی سے بھی
زیادہ نرم تھے اور خوبصورت، سڈول پنڈلیاں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی دکھائی دیتی
تھیں یا شاید وہ دو شگفتہ ٹہنیاں تھیں جن کے سرے پر پاؤں کے دو گلابی کنول کھلے ہوئے تھے

مسافری کے مالک نے کہا:

"خان کی بیوی ہے، ولایت سے ......"

"کون خان؟" باپو نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"تحصیلدار صاحب!"

سندر نے چٹکتے ہوئے کہا "ارے جھلو کی ......"

باپو نے غصے سے سندر کی طرف دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بولا "چپ
رہو ـــــ حرامکار"

میں نے دل میں سوچا۔ ولایت سے آئی ہے تبھی تو۔ ولایت سے تو ٹنگ باران
زیادہ مرغ آتے ہیں مگر ٹنگ باران مرغیاں آ جائیں تو کون ہضم کرتا ہے۔ پھر آخر تو پینے
کے بھی ہیں۔ خانصاحب کو پینے آئی ہو گی۔ اور کرسمس کے میلے میں یہ لوگ گھنٹہ گھر کے
ارد گرد ننگے ناچیں گے۔ یہاں ہم جیسے ڈھوک میں ان کو کون ناچتے دیکھے گا۔ ان پریوں
اور تحصیلداروں کے لئے وہی جگہ مناسب ہے۔ اس پار، دو میٹ گار سے پرے...

اس دن شام کو ہم اداس خاطر ہو کر واپس لوٹے۔ مگر تب بھی سندر نے اپنی پرانی
پگڑی کو پھاڑا، چلم کو صاف کیا، نیا تہمد باندھا اور ڈھوک کے چوپال کی طرف چلا گیا۔
وہاں چوپال میں بہت سے لوگ آ کر بیٹھا کرتے تھے جن کی باتوں کا محور پیپل اور برگد

گندیوں کو صاف کر جاتا اور ایک خستہ سی دیوار کے نیچے بڑی سی کھوہ میں بنت سے اُسے سلگا کر چلا جاتا۔ راستے اس کام کا ثواب خاص خدا کی درگاہ سے ملتا تھا، جہاں بیٹھ کر مدرسے کے تعمید (تو جو) نجھے گرسا اور خان صاحب کی بیوی کی بے حیائی کا تذکرہ کیا۔

اس دن ماں نے بھابھی لکھمی کو ہدایت دی کہ تخمیر سے آٹے میں ڈالے جانے والے انڈے (ہوں) تو گندے انڈوں سے علیحدہ کر دے۔ اس دن بھابھی لکھمی کو فرصت نہ تھی۔ منجھو چونکہ گلے میں ایک بڑا سا پھوڑا نکل آیا تھا جسے دکھانے کے لئے وہ ڈھونکنے کے سبب سے بڑے جراح کے پاس گئی اور جراح کے بے وقت نیز نشتر سے وہ پھوڑا نہایت خوفناک شکل اختیار کر گیا۔ لکھمی منجھو کو گودی میں ڈالے سارا دن روتی رہی۔۔

اگلی صبح جب ہم تینوں بھائی کام کر رہے تھے تو بابو حسب دستور گالیاں دیتا ہوا چلا آیا اور سندر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا:

"تم نے انڈے دیکھے تھے؟"

"بھابھی کے سپرد کئے تھے۔"

"اس حرامکار کے سپرد؟۔۔۔۔۔۔ اس نے پانی میں ہی ڈال کر نہیں دیکھے نصف انڈے گندے ہیں۔ نقصان اس رہے ہو، میں یہ خسارہ تمہارے باپ سے، تمہارے دادا سے پورا کروں گا، سور کے بچے۔۔۔۔۔"

سندر نے ذرا تیز ہوتے ہوئے کہا۔

"منجھو مر رہی ہے اور آپ کو انڈوں کی پڑی ہے۔ یہ پیسے رہنے دیجئے اپنے انڈے

وٹرسپ......؟

بالپو نے سندر کی بات کو نہیں سنا اور بولتا چلا گیا۔ آخر میں ایک تھپّڑ اٹھا اور سندر پر چھینک دیا۔ اس کی آنکھ بالی بالی بچی۔ بالپو بولا:

دیکھیں تمہیں پتہ ہے نا....... اسے کرسی پر بٹھا چھوڑ دیا جیسے، کیوں رے؟

سندر کی چھاتی غصے سے بھرنے لگی وہ بال بچوں والا ہو چکا تھا پھر بھی بالپو اسے مارنے سے نہیں چوکتا۔ اس نے شعلہ فگن آنکھوں سے ایک مرتبہ بالپو کی طرف دیکھا اور پھر ٹوکرے ہوئے میں دھکنے والی ڈبل روٹیوں کی طرف ...... اور وہیں بیٹھا اٹھا کر ڈبل روٹیاں نکالنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے انڈوں کے لعاب میں انگلی ڈالی اور پھر اس کی نظر کھاڑی کے اس پار اٹھ گئی ــــ جہاں سے مچھیرنیں آتی تھیں جن کی چھاتیاں چٹان کی طرح ابھری ہوتی ہوتیں۔ جن کے جسم پر کپڑے کس کر آتے تھے تو ان کے جسم کے ایک ایک عضو کی وضاحت کرتے۔ جیسے تازہ ڈبل روٹیوں سے بھی زیادہ نرم ہوتے اور پاؤں ہوا کی سی ہلکی سینڈلوں میں کنول کے پھول کی طرح ....

موٹی موٹی ڈبل روٹیوں، بسکٹوں اور سال میں بارہ مہینے دہکتے ہوئے دوزخ سے فرار کتنا جاں بخش ہوتا ہے۔ سندر کا تخیّل بہت زیادہ بیدار ہو چکا تھا۔ بیوی کی نت نئی پیداوار تازیانہ بن جاتی تھی۔ وہ اکثر پانی میں ڈوبی ہوئی ریت کی چھتری اور دوسرے کنارے پر پتلی سی پانی کی لکیر کو بیک وقت دیکھا کرتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب سندر نے بالپو کے سامنے دوسرے کنارے پر جاکر قسمت آزمائی کرنے کا عزم پیش کیا اور آخر ایک دن ہم سب لوگ نے سیٹھ کے بھاری کام سے فارغ ہو کر

کے کنارے آ موجود ہوئے۔ اس دن بھی کھاڑی میں طوفانی کیفیت تھی۔ بڑی بڑی لہریں فیری کو تھپیڑے مار رہی تھیں۔ کچھ ماہی گیر اپنے بڑے سے جال کو گھسیٹ کر کشتی کے انبار پر پھینک رہے تھے۔ اس کے بعد انڈے الٹے گئے۔ بڑے بڑے ارزقی انڈے جو دیسی مرغیوں نے لیگ ہارن مرغوں سے جفت ہو کر دیئے تھے۔ اس کے بعد ہُوہُو کی آواز آئی اور ہم نے دیکھا تحصیلدار صاحب کا خانساماں اکرم جو ہمارے ہاں سے ڈبل روٹیاں لے جایا کرتا تھا کسی چیز کو ایک خوبصورت شال میں لپیٹے ہوئے فیری کی طرف لایا کچھ دیر بعد اس شال میں سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ہمیں پتہ چلا کہ وہ تحصیلدار کا لڑکا ہے۔ جو تین چار دن ہوئے میم صاحب کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ میں نے اپنے منجھلے بھائی کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے اونچا ہو کر دیکھا۔ بچہ نہایت خوبصورت اور تندرست تھا۔ اس کے منہ پر گلے کے قریب ایک بہت ہلکی سی پھنسی نکل آئی تھی۔ اور اسے مرہم پٹی کے لئے دوسرے کنارے پر بڑے ہسپتال میں بھیجا جا رہا تھا...

سندر نے فیری پر قدم رکھا۔ اس سے پہلے ہمارے گھر میں سے کوئی بھی آدمی رخصت نہ ہوا تھا۔ چار پانچ مہینے کے لئے بھی نہیں اور آج یہ بھائی نہ جانے کتنی مدت کے لئے مجھ سے جدا ہو کر اس پار جا رہا تھا۔ چند روز پیشتر ایک مرمت طلب گھڑی کی بابت سندر اور مجھ میں بہت سر پھٹول ہو گئی تھی اور آخر وہ گھڑی میں نے اسے نہ دی۔ آج جیب میں سے خود ہی وہ مرمت طلب گھڑی اپنے رخصت ہوتے ہوئے بھائی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دے دی تو اس نے انکار کر دیا۔ بولا:

"رجو! بھیا رکھو اسے تم،..... تم مجھ سے چھوٹے نہیں ہو کیا؟"

"نہیں تم لے لو اسے، سندر" میں نے اصرار سے کہا۔

"جانے بھی دو۔" سندر بولا "تمہاری کلائی پر کتنی خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔ اے کاش! میرے پاس کچھ اور بھی ہوتا جسے میں اپنے چھوٹے بھائی کو رخصت ہوتے ہوئے دیتا۔"

میں نے زبردستی وہ گھڑی اپنے بھائی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا "تم اتنے بڑے شہر جا رہے ہو، وہاں قدم قدم پر وقت کی ضرورت ہوگی تمہیں، لو رے لو، لو۔"
نہ جانے سندر کے جی میں کیا آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور روتے ہوئے اس نے میرا ناچیز تحفہ قبول کر لیا۔

بھابی نے حیا کی وجہ سے آنچل منہ کے سامنے کچھ رکھا تھا جب بھی جذبات اسے کچھ اجازت دیتے تو وہ سندر کے پاس ٹیری میں رکھی ہوئی گٹھڑی کی طرف اشارہ کر دیتی جس میں اس نے کچھ مٹھیاں باندھ دی تھیں۔ وہ کہتی تھی —— تمہارے دو چار دن کے لئے کافی ہوں گی۔ ہاں دیکھنا! انہیں گھی میں بھون رکھا ہے ان کے کھانے کے بعد پانی نہ پینا۔ کھانسی ہو جائے گی۔ اور اگر پانی کے بغیر نہ بھی رہ سکو تو پینے کے بعد پھر ان میں سے تھوڑا اور کھا لینا۔ گلہ صاف ہو جائے گا۔ تنور کی روٹی نہ کھانا۔ پیٹ میں درد ہوگی۔ اس سے تو آپ ہی تکلیف کر لینا اچھا ہے۔ دودھ روز نہ میسر آئے تو دوسرے تیسرے ہی سہی مگر پینا ضرور۔ کتنے کمزور ہو رہے ہو۔ تمہارے جسم سے تو کوا بھی سیر نہیں ہو سکتا۔ اے کاش! تم مجھے ساتھ لے چلتے اور میں تمہاری خدمت کرتی۔ تمہیں بوجھل تو نہ ہوتی۔ پھر دل میں کہتی —— اس نامہر کے دل میں شاید میم کا شوق ہے...... اور آنسو ٹپ ٹپ بھابی کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

باپ نے رقت بھرے گلے سے کہا:

"بیٹیا! میں تمہیں مارا کرتا تھا، بیٹیا ...... اسے بھول جانا اس بڈھے کے پاگل پن کو ......"

سندر جو اس وقت تک بہ ضبط کئے ہوئے تھا، رو دیا۔ "بابا! بابا! مارتے تو تھے تم، اور پھر خود ہی سینکنے سک جاتے۔ نہ ممی بھی تو تلاش کرتے تھے۔ بھول گئے کیا؟"

—— اور قبری ہمارے مجروح دل کی طرح تھپیڑے کھاتی ہوئی دوسرے کنارے پر پہنچ دی اور ہم سب لوگ طوفانِ بادو باراں میں کھڑے صبری، چادر یا رومال ہلاتے رہے۔ آخر بارش نے ہوا میں اڑنے والے کپڑوں کو بھگو دیا اور نظر کی کم مائیگی نے ہمارا یہ نحیف سا رشتہ بھی توڑ دیا —— !

سندر کے چلے جانے کا اثر ہم سب پر بہت مختلف طریقوں سے ہوا۔ مثلاً میرا منجھلا بھائی سوہنا تمام دن غمگین رہنے لگا۔ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی۔ اسے سندر سے خاص لگاؤ تھا اور تلے کے بھائیوں میں لڑائی بھی بہت ہوتی ہے اور محبت بھی۔ میں بھی عموماً اُس خاطر رہا کرتا تھا اور بات بات پر ماں اور بھابی سے جھگڑا کرتا۔ میں نہیں جانتا ہمارے جھگڑوں میں قصور زیادہ کس کا ہوتا ہے۔ اگر میں اپنی بے قصوری جتاؤں، تو یہ یقیناً یک طرفہ فیصلہ ہوگا لیکن یہ بات تو ضرور تھی کہ اپنے بیٹے اور خاوند کی جدائی کی وجہ سے وہ دونوں عورتیں رو رو کر چڑچڑی ہو گئی تھیں اور میری چھوٹی سی ضد کو بھی برداشت نہ کرتی تھیں۔

...... اور جب سندر کے تینوں بچے بلکتے اور ننھا اپنی ماں کی بے دودھ چھاتی کو دانتوں سے کاٹ لیتا تو بھابی بڑے زور سے اسے چارپائی کے نیچے دھکا دے

دیتی۔ اور پھر بچے کے شور، ماں کی ملامت، باپو کی گالیوں، اور بھابی کے رونے سے گھبرا کر میں گھر سے باہر چلا جاتا۔ اس وقت میں خوش ہو کر کہتا۔ اچھا ہوا سندر چلا گیا۔ اب وہ کم سے کم ایک بڑا تحصیلدار تو بن ہی جائے گا اور وہاں وہ بھی کسی پری کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہوگا۔ کیا عجب جو وہ اس وقت گھنٹہ گھر کے اردگرد ناچ رہا ہو...... ننگا......

اس دفعہ گرمیوں میں ہی بیکن آن پڑا۔ شاید صاحب لوگوں کا گرمیوں میں بھی میلہ ہوتا ہے۔ جیسے ایسٹر کہتے ہیں...... نتھو گجرانی اپنی مہینے بھر کی محنت، ایک ہزار جوتے ٹنڈوں کے پھینک گئی اور ہمارا بھاڑ دوزخی آگ سے دن رات پھنکنے لگا۔ ہم دونوں بھائی نہایت محنت سے سنگتروں کے چھلکے سکھاتے، کوٹتے، انڈے پانی میں اکٹھے کرتے اور پھر دوزخ میں جا کر اپنی ازلی سزا بھگتتے۔

ایک دن سوہنے کی شکل نہایت مہیب ہوگئی۔ سنگتروں کے پسینہ اور اس کے جذبات کے تاثرات نے مل کر اس کی شکل کو بہت خوفناک بنا دیا۔ اس نے اپنی شعلہ فگن نگاہوں کو مجھ پر پھینکتے ہوئے کہا:

”رجو......“

میں نے بغیر جواب دیئے اپنا منہ اس کی طرف پھیر لیا۔ وہ بولا۔

”سندر تو چلا گیا ہے اُس پار...... اور میں بھی پیچھے سے بھاگ جاؤں گا۔“

اس وقت میں ایک دہشت کے احساس سے کانپا۔ آخر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے میں نے کہا ”الو کہیں کا!“

”پتہ تجھے دیتا ہوں...... باپو کو نہ کہیو، مجھ سے یہاں زندہ نہ رہا جائے گا۔“

میں نے خشمگین ہوتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا مطلب ہے ۔۔۔ میں یہاں اکیلا مرا کروں؟ تنہا ہی بھاڑ جھونکوں؟ واہ رے نواب کے بیٹے! ۔۔۔۔۔ میں آج ہی کہہ دوں گا باپو کو۔"

سوہنے نے فوراً خوانچہ ایندھن پر پھینک دیا اور جھپٹ کر میری گردن دبوچ لی اور اس زور سے گلا دبایا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں اور شور بھی میرے گلے ہی گھٹ گیا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور سوہنے نے میری گردن چھوڑ دی۔ لیکن شام کے وقت جب میں نے باپو کو دور سے دیکھا تو میں بھاگ کر اس کے پاس چلا گیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے سوہنے کی حرکت بیان کی اور اس کے خوفناک ارادہ سے مطلع کیا۔

باپو نے اسی وقت پانی میں بھگویا ہوا بید اٹھایا اور اسے سوہنے کے جسم کے ساتھ پیوست کر دیا۔ سوہنے نے بید کی چھڑی پکڑ لی اور ایک جھٹکے سے باپو کے ہاتھ سے چھین لی۔ اسے توڑا، مروڑا اور دور پھینک دیا۔ باپو کے ہاتھ ایک لمحہ کے لیے لرز اٹھے لیکن یہ دیکھ کر کہ سوہنا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا ہے، "وہ حرامکار ۔۔۔۔۔ حرامکار" کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور فیری کے مالک سے مل آئے اور اسے کہہ دیا کہ اگر سوہنا تمہیں گھاٹی سے پار جانے کے لیے کہے تو انکار کر دینا۔

سوہنے کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا۔ اب اس کے پاس سوائے اس بات کے چارہ نہ تھا کہ روز بلا ناغہ خمیرے آٹے کو ہوا میں اچھالے اور وہ گول چکر کاٹتا ہوا اس کے ہاتھوں میں آ گرے۔

ایک دن میں بھاڑ کے قریب سے اٹھ کر، پسینہ سے شرابور، ہوا میں چلا گیا۔

اور مجھے بخار ہو گیا۔ اس کے بعد پھیپھڑوں کو ہوا لگ گئی لیکن زندگی کے سانس باقی تھے۔
دارو درمن سے بچ رہا۔ ان دنوں سوہنا بکیری میں اکیلا کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی باپو ہاتھ
بٹا دیتے تھے لیکن اب، باپو بہت بوڑھے ہو چکے تھے، ان کا کام کرنا نہ کرنے کے برابر ہوتا
تھا۔ ان دنوں سوہنا جب بھی میرے پاس تیمارداری کی غرض سے آتا تو کہتا۔

"یہ دنیا دکھوں سے بھری پڑی ہے .... اس سے تو چھٹکارا ہو جائے
تو اچھا ہے۔"

میں خاموشی سے کہتا۔

"ہاں سوہن ...... اور دیکھتے ہو، سانس بھی تو نہیں لیا جاتا۔ اس سے بڑا
اور دکھ کیا ہوگا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ میں ......"

سوہنے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا:

"نہیں بھائی ..... اچھے ہو جاؤ گے تم۔"

"شاید پندرہ بیس دن اور تمہیں اکیلے کام کرنا پڑے، بڑی مصیبت ہے۔"

"کوئی نہیں، تم اچھے ہو جاؤ ......"

ابھی میں اچھی طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ مجھے دو چرواہے اپنے گھر کی طرف
بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کے بعد گھر بھر میں افراتفری پھیل گئی اور ڈھوک عبدالصمد
کی دو گوجرانیاں آگئیں اور بولیں "چوپال میں برگد کے نیچے سوہنا مرا پڑا ہے۔"

میں اپنے آپ میں کچھ سکت پاتے ہوئے چوپال کی طرف دوڑا۔ وہاں قصبے کے
بہت سے لوگ جمع تھے۔ انہوں نے میرے لئے خود بخود راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا
سوہنے کی دونوں آنکھیں باہر ابھر آئی تھیں اور زبان ڈھیلی ہو کر منہ کے ایک

طرف باہر نکل آئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک رستہ پڑا تھا جسے وہ دو دھ دوہتے وقت اپنی گنگ سے کی پچھلی ٹانگوں میں باندھا کرتا تھا ـــــ تو سوہنے نے خودکشی کرلی اور تمام آگ اور خمیرے آٹے سے نجات حاصل کرلی۔ اب وہ تمام دکھوں تکلیفوں سے چھٹکارا پاکر اس چوپال میں جہاں وہ بیٹھ کر اپنا حقہ سلگایا کرتا تھا، اپنی گو لردوں کے بچھونے پر پڑا تھا۔ اسی جگہ جہاں وہ سندر کے ساتھ بیٹھ کر نامکمل الو جود شکیلہ کی زندگی کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔

میں نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے باپو کے شانے کو زور سے پکڑ لیا اور کہا :

"باپو"

باپو نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "باپو، اسے جلانا مت۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ڈھولکا انچارج بولا "تو سسکار کیسے ہوگا؟"

میں نے باپو سے کہا "آگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہی تو سوہنے نے یہ کیا ہے ، باپو، کیا تم پھر اسے آگ میں پھینک دوگے؟"

سندر کو کتنی خط واپسی کے لئے ڈالے گئے لیکن اس نے ایک بھی خط کا جواب نہ دیا۔ میں نے سوچا وہ کہیں اپنی ہی رنگ رلیوں میں مصروف ہوگا۔ ایک دو سال بعد سوہنے کی موت کا غم کچھ ہلکا ہوا تو باپو کی باری آئی اور ایک دن وہ سونے کے لئے گئے تو پھر نہ اٹھے۔

اس کے بعد بیکری کا کام میرے ذمے پڑگیا۔ جب میں بہت مایوس ہوا تو پھر سندر کو ایک چھٹی لکھ ڈالی اور حسب معمول کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے سوچا، سندر

اُس پار، عیش و عشرت میں مشغول یہاں کیوں آنے لگا۔ اچھا ہوا جو وہ ادھر چلا گیا اور جب میں نے زیادہ گہری نظر سے جانچا تو میرے دل نے کہا سوہنے نے بھی اچھا ہی کیا۔ جو سب دکھوں تکلیفوں سے نجات حاصل کر لی۔

——— اور آخر ایک دن ہمیں ایک بوڑھا اپنی دکان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے منہ پر سینکڑوں جھریاں تھیں۔ میں نے نہیں بلکہ میرے ابو نے پہچان لیا کہ وہ سندر ہے۔ میں دوڑ کر اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔ ہم سب بہت دیر تک روتے رہے۔ حتّٰی کہ مجھے اس کی ہیئت کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخر ان تاثرات کی بنا پر جو کہ میرے ذہن میں اچھی طرح منقش تھے۔ میں نے سندر کو ہنسانے ہیتے کہا۔ "واہ رے میرے نائب تحصیلدار! ......"

سندر مسکرا دیا

میں نے پھر تنگ کرنے کی غرض سے پوچھا۔ "اور وہ تمہاری میم کہاں ہے؟ یہ پوٹلی اسی نے دی ہو گی تمہیں؟"

اس وقت سندر کو ہلکی سی کھانسی آئی اور اس نے تنور کے قریب ہی تھوک دیا۔ مجھے اس کے تھوک میں ایک سرخ دھبہ سا دکھائی دیا۔ ....

میں دم بخود کھڑا سوچنے لگا۔ کیا دوسرے کنارے پر یہی کچھ ہے۔ یہی جھریاں، یہی امر بیل سی ہلکی ہلکی کھانسی جس میں خون کا دھبہ ہو .... اور وہ سوہنا کس امید پر مر گیا۔ کیوں؟ کس لئے؟ کس کنارے کی تلاش میں؟

اور ایک دن کھاڑی کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے سندر سے کہا:

"سندر تم نے دیکھا ہے، وہ پانی کی لکیر کتنی آب و تاب سے چمکتی ہے۔"

سندر کھانسنے لگا۔ وہ ایک جگہ دم لینے کے لئے ٹھہر گیا اور بولا: "اس پانی کا بھول کر بھی خیال نہ کرتا رہو! وہ جو تمہیں چمکتا ہوا پانی دکھائی دیتا ہے وہ ریت کے چمکتے ہوئے لاکھوں ذرے ہیں اور اگر یہ نیلی نیلی خوب صورت کھاڑی سوکھ بھی جائے تو وہ پانی نہیں سوکھے گا اور ابد الآباد تک چمکتا چلا جائے گا۔

آلو

لکھی سنگھ سائیکل سٹال کے قریب بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس وقت نہ تو اسے ہندوستان
کی اقتصادی بدحالی کا خیال تھا اور نہ ٹھاکر دیوں کی ہڑتال کے متعلق تشویش تھی۔ آج
شام کو گھر پکانے کے لئے کیا لے جائے۔ بس اسی بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔
گھر میں صحن کا تین چوتھائی حصہ چھوڑ کر باقی میں بسنتو نے پام اور پارا کراس کے علاوہ
پودینہ اور بینگن کے پودے لگا رکھے تھے۔ لیکن ابھی تو بینگن کے پودوں نے نیلے
نیلے' اودے اودے پھول ہی نکالے تھے۔ ابھی تو ان میں پگ منٹس (PIGMENTS)
کی نشوونما بھی اچھی طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں بینگنوں کا خیال کرنا تو محض ایک
احمقانہ بات تھی۔

لکھی سنگھ شروع سے پودوں کی کاشت کے خلاف تھا حالانکہ بسنتو گھر میں

ہریاول کو بہت پسند کرتی تھی۔ سبزی آنکھوں کو طراوت دیتی ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن لکھی سنگھ نہایت بے صبر انسان تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج ہی بیج بو دیا جائے اور آج ہی پھل لگ جائیں۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق بھی اس کا کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ پودوں کو روزمرہ پانی دینا، ان کی نگہداشت اور پھر انہیں نہایت سست رفتار سے بڑھتے دیکھنا اس کی تاب و تواں سے باہر تھا۔ اسی لئے تو اس نے سنتو کو صاف کہہ دیا تھا کہ پودے اگانے کے بعد میں ولگا چلا جاؤں گا۔ وہاں دو چار ہفتے رہوں گا۔ تاکہ میری واپسی پر بینگن پھل رہے ہوں اور یہی محسوس ہو۔ جیسے میں نے کل ہی انہیں بویا ہے اور آج پھل بھی لے لئے ہیں۔

لکھی سنگھ نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ سب کام ٹھپ ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے کانوں میں ان کی پرشور بحث کی گونج باقی تھی۔ پھر اسے خیال آیا۔ خاکروبوں کی ہڑتال کس قدر مکمل ہوئی ہے۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں، گنجان آباد محلوں، گزرگاہوں اور سڑکوں پر جا بجا کوڑے کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ شاہ عالمی کے باہر گھوڑوں کے حوض کے قریب میلے کا پہاڑ پڑا ہے۔ ٹھنڈی سڑک کی طرف جانے والی سڑک پر تین دن سے ایک بیل مرا پڑا ہے جس کی لاش سے سڑاند اٹھ کر ہسپتال کے مریضوں تک پہنچ رہی ہے۔ اس کے اپنے کوچہ بھوانی میں جہاں شہر کے مردے جلانے والے اچارج رہتے ہیں اتنا تعفن پیدا ہو رہا ہے کہ اچارج باہر نہیں نکلتے اور ہندو کا مردہ بغیر اچارج کے کیسے جلایا جا سکتا ہے؟ یقیناً بہت سے مردے گلی محلوں میں پڑے ہوئے بو پھیلا رہے ہوں گے۔ ٹھنڈی سڑک کے قریب پڑے ہوئے بیل کی طرح

کھڑکی کی راہ سے ایک تیز بدبو آنے سے لکھی سنگھ اتنا اداس ہوا کہ اس نے تمام دروازے

بند کر لیے۔ دائیں طرف گھومنے سے اس کی نگاہیں سائیکلوسٹائل کے اور ایک کھونٹی
پر جا پڑیں۔ اس کھونٹی پر کامریڈ بخشی کی ہیٹ ٹنگی رہ گئی تھی جس کے ایک طرف سُرخ
پروں کا ایک خوبصورت پھُوم لگا ہوا تھا۔ آخر بخشی نے سرکاری ملازمت کر لی تھی۔
اس لئے سب کامریڈ مل کر براؤننگ کی نظم "وہ چند چاندی کی ٹکلیوں کے عوض ہمیں چھوڑ
گیا" گاتے رہے تھے۔ بخشی رجعت پسند ہو گیا تھا۔ سب نے کامریڈ سے محبت کی تھی۔
اور راہبری کے لئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے گیت گائے تھے۔ اس کے افسانوں
کی تعریف کی تھی اور اب؟ . . . . . . لیکن سو روپیہ ماہانہ لینے پر بھی اس کا چہرہ
اس قدر اترا ہوا تھا وہ بار بار گھبرا کر اپنی پتلون کی کریز ٹھیک کرتا تھا اور بے تحاشا آنکھیں
جھپکتا تھا . . . . شروع بحث میں نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی اور اسے
پیٹا بھی گیا تھا۔ اس کی قمیص کا ایک چیتھڑا ابھی تک ایک کرسی کے ابھرے ہوئے کیل
میں اٹکا ہوا تھا۔ اس نے پیٹ کی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے ہر ایک کے جذبۂ رحم کو ابھارنے
کی کوشش کی تھی لیکن وہاں سب کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ معلوم ہوتا ہے اتنے بڑے
نصب العین سے گر جانے کا اسے خود بھی احساس تھا۔ لیکن وہ ایک حد تک مجبور تھا۔
اس کی تین بہنیں تھیں۔ شادی کے قابل۔ ایک بوڑھا باپ ـــــــ ڈاکٹر جو کہ
کسی ریاست سے ریٹائر ہوا تھا۔ اور جس کی بینائی زیادہ احتیاط کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔
اس کے علاوہ چار بھائی تھے جن میں سے دو مقامی ہائی سکولوں میں اور سب سے بڑا شہر
سے باہر ایک کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ اور ان سب کے پیٹ [illegible] اٹھتے تھے۔ بخشی
نے ہر ایک سے اعتراف [illegible] کی لیکن کسی نے اس کی
ایک نہ سنی۔ اور پیٹھ جتانے کے فوراً بعد ہی وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور [illegible]

میں اپنی سیٹ بھی وہیں چھوڑ گیا۔

لکھی سنگھ نے کہا۔ کاش اکبشی کا کوٹ ٹنگا رہ جاتا تو آج کی روٹی سے تو نجات حاصل ہو جاتی۔ پھر اسے بسنتو کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا بسنتو صحیح معنوں میں کامریڈ ہے۔ اتنی خستہ حالت ہونے کے باوجود اس نے آج تک مجھے یہ یقین نہیں ہونے دیا کہ میں تم سے تلاش آدمی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مجبوری کے دنوں میں وہ میلے کچیلے چیتھڑے، ونگا سے آئی ہوئی گندم کا چھان، ایک گمنام سا پرچہ جس کا لکھی سنگھ ایڈیٹر رہا تھا۔ اس نے ردی بیچ کر کئی کئی دن گزار دیا کرتی تھی۔ وہ نام نہاد عزت کے خیال سے کبھی نہیں ڈری تھی اور اپنے سوشلسٹ خاوند پر بار ثابت نہ ہونے کے لئے اس نے پڑوس کے لوگوں کی قمیضیں سینی شروع کر دی تھیں۔ ایک دفعہ اس نے کوڑیوں کے مول محلہ کے تمام لوگوں سے پھٹی ہوئی جرابیں خرید لیں۔ ان کے تار نکالے اور انہیں پانچ منڈی کے ایک جرابوں کے کارخانے میں بیچ دیا بسنتو بڑی وسیلہ ساز عورت تھی اور لکھی سنگھ مطمئن تھا۔

لکھی سنگھ اٹھا اور ایک انگڑائی لی۔ وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہنسنے لگا۔ ہنسنے کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا اور وہ ہنسی نہ ردعمل کی ہنسی تھی اور نہ کوئی درد تھا جو حد سے گزر کر دوا ہو گیا تھا وہ ایک بے معنی، کھوکھلی سی ہنسی تھی جو کہ آناً فاناً جیب میں پیسے ختم ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے اور خیال آتا ہے ——— بھئی خوب رہی، چلو؛ بڑے دیش بھگت بنتے تھے۔ لیکن اس کامریڈ کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ رد سی کا مینا تلو ورچ ......

——— آخر روٹی سے بنتا ہی کیا ہے۔ یہ بھی تو ایک وجہ ہے کہ ہنسا

جاتے اور ملکھی سنگھ آہستہ آہستہ بیٹھک پر سے اترا اور پری محل سے نکل کر سرکلر روڈ کی طرف چل دیا۔ بازار میں کتے دہی بڑے کے خالی پتے چاٹ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کا دودھ سے بھرا ہوا آب خورہ بازار میں گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور سرمئی سیاہ سڑک پر بکھرا ہوا دودھ اتنا بھیانک دکھائی دیتا تھا جیسے قحط کے دنوں میں گورنر کے فلاور شو کا کوئی بڑا سا کرائی سینتھیمم سر بازار رکھ دیا جائے...... لڑکی سوگ باختہ ہو کر آب خورے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی۔ گویا انہی ٹکڑوں کو سمیٹ کر گھر لے جائے گی!

آسمان پر کاٹن مل کے دھوئیں کی ایک لمبی سی لکیر چیمبرلین روڈ تک چلی آئی تھی۔ اگرچہ گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا تاہم فضا میں خنکی باقی تھی اور دھوئیں کے ٹکڑے آسمان کی سپیدی مائل نیلاہٹ کے خلاف دھبوں کی صورت میں چار سُو بکھرے ہوئے تھے۔ اچانک ایک تیز سی بدبو نے ملکھی سنگھ کو ناک پر رومال رکھنے کے لئے مجبور کر دیا اور وہ سوچنے لگا۔ کمیٹی کی طرف سے اس میلے کے نکاس کا خاطر خواہ بندوبست نہیں۔ لوگوں کے گھر غلاظت سے بھرے پڑے ہیں لیکن پھر بھی لوگ برابر ایک پیٹ کی ضرورت سے زیادہ کھاتے جاتے ہیں۔

اب تک ملکھی سنگھ سبزی منڈی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ منڈی کے دروازے سے کچھ چھکڑے چیں چیں ریں ریں کرتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے بیل گردن کے قریب سے زخمی تھے۔ اس کے باوجود نہ تو جوت کو پرے کھسکایا گیا تھا اور نہ ہی لکڑی کے سخت لٹھے اور اس پر زیبائش کے لئے لگائے ہوئے پیتل کے پتروں کے گرد کوئی چیتھڑا لپیٹا گیا تھا۔ گاڑی بان بیلوں سے گزر کر ان کے مالکوں اور رکھنے والوں کو

گولیاں دے رہے تھے۔ گوالمنڈی چوک کو اکالیوں کے ایک لمبے چوڑے جلوس نے روک رکھا تھا۔ یہ لوگ سرگودہا میں مورچہ لگانے کی بابت سوچ رہے تھے لکھی سنگھ نے اتفاق سے اپنا ہاتھ ایک چھکڑے کے پیچھے رکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک آلو آگیا . . . . . یہ وہی چھکڑے تھے جو کہ ہر روز صبح ساندہ شمس الدین کی طرف سے آلوؤں کی بوریاں لے کر سبزی منڈی کو آتے اور اپنی دانست میں تمام آلو انڈیل کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔ پھر بھی دُھرے کے قریب یا کسی گانٹھ اور اونچ نیچ میں کوئی نہ کوئی آلو اٹکا رہ جاتا۔ لکھی سنگھ نے تمام چھکڑوں کے پیچھے سے ٹٹول ٹٹول کر سیر بھر کے قریب آلو اکٹھے کر لئے اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ آنسو نہ تو غم کے تھے اور نہ مسرت کے بلکہ یونہی خلاؤں میں ایک جذبۂ تشکر و امتنان کا اظہار۔ یا وہ آنسو ایسے تھے جو خالی جیب کے آناً فاناً بھر جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

لکھی سنگھ نے گھر پہنچ کر تمام آلو بسنتو کے سامنے بکھیر دیئے۔ آج بسنتو شام ہی سے لکھی سنگھ کی راہ تک رہی تھی۔ آج اس وسیلہ ساز عورت کو بھی کامریڈ کے آنے سے پہلے کوئی چیز پکانے کی ترکیب نہیں سوجھی تھی۔ اچانک اندر سے لکھی سنگھ کا بڑا لڑکا کرنیل نمودار ہوا اور رسوئی میں بکھرے ہوئے آلوؤں کو ہوا میں اچھالنے لگا۔ لکھی سنگھ نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پہ لگا دی اور آلو سمیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کمائی یونہی برباد کی جائے اور کرنیل رویا نہیں۔ کیونکہ ایسی باتیں تو ہر روز ہوتی تھیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ میسر نہ آتا تھا اور اس کے بعد جب وہ کسی چیز کی طرف حریصانہ نگاہ سے دیکھتا تو ماں یا باپ کی طرف سے ایک چپت رسید ہو جاتی۔ اگرچہ کل کی چپت سے اس روز کی چپت زیادہ سخت تھی تاہم

اس سے کرینل کو ایک اور شرارت کا موقع آسانی سے میسر ہو گیا۔ اس نے شیشے کے سامنے سے بام اٹھائی اور نصف سے زیادہ اپنے ماتھے پر مل لی۔ کرینل کو بام ملنے کا بہت شوق تھا۔ اسے وہ پیشانی پر ٹھنڈی لگا کرتی تھی۔ وہ بام لکھی سنگھ نے بسنتو کے لئے خریدی تھی کیونکہ وہ لیکوریا کی مریضہ تھی اور اسے ہمیشہ سر درد رہتا تھا۔ لکھی سنگھ نے بام کو ضائع ہوتے دیکھ کر دوسری گال پر بھی طمانچہ مارنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سوچنے لگا کہ بام تو پہلے ہی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی ہے۔

اس وقت لکھی سنگھ کو بھوک لگ رہی تھی اور وہ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بات بال بچوں کی تربیت سے شروع کی اور کہنے لگا۔ بچے تو انگریز عورتوں کو پالنے آتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کو ماں بننے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ بسنتو اس طور پر انگریزوں کی تعریف نہیں سن سکتی تھی اور عموماً بات یہاں ختم ہوتی —— ان لوگوں کے پاس بچوں کو کھلانے کے لئے آیا ہوتی ہے۔ روٹیاں پکانے کے لئے خانسامے ...... اور لکھی سنگھ ایسی باتیں سن کر چپ ہو جایا کرتا تھا۔ سوشلسٹوں کے حلقہ میں وہ گھنٹوں بحث کر سکتا تھا۔ لیکن اس جگہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ حقیقت اتنی تلخ ہوتی تھی۔ کہ اسے اپنے چہرے کا عکس دکھائی دینے لگتا۔ لیکن آج اس بات پر بھی بسنتو خاموش رہی۔ اچانک دروازے کی طرف سے سخت سردی ہوا آئی اور لکھی سنگھ گرج کر بولا۔

"تم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ دروازہ بند کر دیتیں ...... بس نواب زادی ہی بننا چاہتی ہو تم۔"

بسنتو نے اٹھ کر چپکے سے دروازہ بند کر دیا۔

لکھی سنگھ اپنی داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سوئی لگا کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ بھوک،

کی وجہ سے اسے ڈکار آرہے تھے اور پیٹ میں ناف سے اوپر ایک عجیب طرح کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے سیلاب میں دریا کے کنارے ایک پرشور آواز کے ساتھ پانی میں گرتے ہیں۔ اسے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پیٹ کی دیواروں سے کوئی چیز اندر معدے میں گر رہی ہے۔ یکایک لکھی سنگھ کو کچھ سوجھ گیا۔ پودوں کو اپنے سامنے پا کر بولا۔

"بھلا ان بینگن کے پودوں کا فائدہ ہی کیا؟"

"فائدہ کیوں نہیں؟" بسنتو نے آلوؤں کو دیگچی میں ڈالتے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ لیکن لکھی سنگھ اپنے مخصوص، دو اپیا انداز سے گرجا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ انہیں، ابھی، اسی وقت اکھاڑ کر پھینک دوں۔ دو مہینے سے اوپر ہونے کو آئے ہیں اور ان میں پھل کا نام و نشان تک نہیں"

لکھی سنگھ اور بسنتو میں اس بات پر بہت جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ کڑھتی ہوئی بسنتو بولی۔

"تبھی تو تمہیں بچوں سے نفرت ہے۔"

"بچوں سے مجھے کاہے کو نفرت ہوئی؟"

"اٹھارہ سال کی عمر تک ان کی خدمت کا تم میں صبر کہاں ہے ابھی سے کہہ رہے ہو کہ لکھمیر کو گانا سکھانا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ بچپن ہی میں کمانے لگے اور اسی عمر سے ہم اس کی کمائی کھانے لگیں۔"

لکھی سنگھ خاموش رہا اور مونگی توری کی بیل کے گرے ہوئے سہرے کو کیبل پہ ٹانکنے لگا۔ . . . . بسنتو ماں تھی۔ اس نے بچے اور پودے پالنے اور انہیں آہستہ آہستہ

بڑھتے دیکھنے کا حوصلہ تھا۔ وہ ہر روز صبح اٹھتی اور کہتی ——— آج بینگنوں کو دو پھول لگے ہیں اور دو کی ڈنڈیاں پھول رہی ہیں اور مونگی توری پر بھی شہد کی مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ اب توریاں پھلنے کا موسم آیا ہے نا اور تم نے آخر کریل سنگھ سے کس جگ کا بدلہ لینا ہے؟ آخر ہولے ہولے سمجھ دار ہو جائے گا۔ یونہی اسے پیٹتے رہتے ہو۔ لکھی سنگھ کو خیال آیا۔ کہ مونگی توری کی بیل کو جہاں سے کاٹا گیا تھا۔ وہاں سے زیادہ سرسبز ہے۔ وہاں زیادہ کونپلیں پھوٹی ہیں۔ وہ فوراً بول اٹھا "یہ پودے کاٹنے چھانٹنے سے زیادہ نشوونما پاتے ہیں۔ تبھی تو میں کریل کو مارتا ہوں"

جس دن لکھی سنگھ اور بسنتو کا جھگڑا ہوتا۔ اس دن بسنتو وہی ڈھیلا ڈھالا گلابی بلاؤز پہنتی جس سے لکھی سنگھ کو سخت نفرت تھی۔ اور وہ دوپہر تک سر کے بالوں کو سیدھا نہ کرتی۔ اپنے کپڑوں اور اپنی شکل سے وہ یوں سست اور زرد دکھائی دیتی۔ جیسے وہ حایفہ ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ کراہتی اور لکھی سنگھ آہستہ آہستہ کراہنے سے بہت گھبراتا تھا۔ زور سے رونے کا اس پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہلکی ہلکی چیزیں مثلاً ہلکی کھانسی، ہلکا ہلکا بخار، ہلکا ہلکا ہنسنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت بسنتو اسے مزید تنگ کرنے کے لئے کھاٹ پر اوندھی پڑ جاتی۔ اور پائنتی میں پاؤں اڑا کر یونہی زور لگانے لگتی اور بچہ سفری پنگوڑے میں نصف دھوپ اور نصف چھاؤں میں، ایک ہولناک آواز سے کراہتا رہتا اور پھر یک دم چیخ اٹھتا۔ جیسے اسے چیونٹیوں کے کسی دستہ نے یک لخت کاٹ کھایا ہو۔

ہنڈیا میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ آلو اُبل چکے تھے۔ بسنتو نے انہیں سرد پانی میں انڈیلا اور لکھی سنگھ انہیں چھیل کر کھانے لگا۔ ان آلوؤں کے سوا گھر میں

گرہن

کچھ بھی نہیں تھا اور لکھی سنگھ یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ ان سیر آلوؤں ہی بسنتو، گرنیل، لکھمیر اور بچے کا حصہ ہے۔ وہ کہتا۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے۔ کہ آلو پیٹ کو غلیظ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نمک مرچ لگا کر انہیں چٹخارے لیتا ہوا کھالیتا گویا کہہ رہا ہو۔ مجھے اپنے پیٹ کی غلاظت بہت پسند ہے۔

زندگی خوشگوار تھی۔ اس میں آسائش نہ تھی۔ سوہن حلوہ نہ تھا۔ لیکن آلو تو تھے اور لکھی سنگھ ہر روز شام کو چیمبرلین روڈ پر سے ہوتا ہوا سبزی منڈی کے قریب جا کھڑا ہوتا اور رسانده شمس الدین کو لوٹنے والے چھکڑوں پر سے تمام آلو سمیٹ لیا کرتا۔ اٹھارہ تاریخ کو اسے ہندوستان ٹائمز سے "گداگروں کے مسائل" کے مضمون کے پیسوں کی توقع تھی اور آج بارہ تاریخ تھی۔ پیٹ کی آگ کے لئے آلو کافی تھے۔

اچانک کمیٹی کی طرف سے بیل گاڑیوں کے لئے نیومیٹک ٹائروں کا بل پاس ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب گاڑی بانوں کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہ سو سو روپے کے ٹائر کیسے مہیا کر سکتے تھے؟ کامریڈز کے ایک اجلاس نے گاڑی بانوں کی ہڑتال کروانے کا فیصلہ کر لیا، اور لکھی سنگھ نے بھی ہڑتال کو کامیاب دیکھنے میں سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

ہڑتال کے پہلے ہی روز زندگی آلوؤں سے خالی ہو گئی تھی یکسر خالی۔ ٹیوشن کی تلاش میں سارا دن گھر سے باہر گھومتے رہنے کے بعد لکھی سنگھ بسنتو کی وسیع صابری پہ یقین کرتا ہوا ایک مجرم کی طرح گھر کے اندر داخل ہوا لیکن بسنتو روزمرہ کی طرح آلوؤں کا انتظار کر رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی لکھی سنگھ غور سے بینگن کے پودوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن ابھی تک تو پودوں کے کمزور غل نے بھی اچھی طرح سے نشوونما نہیں پائی تھی۔ لکھی سنگھ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ آلوؤں کے متعلق پوچھے ہی نہیں اور

لڑنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے لڑکر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر پڑے رہیں۔ لکھمی سنگھ چاہتا تھا کہ اس لڑائی کے بعد ہمیشہ کی طرح بسنتو اپنے میکے چلے جانے کی دھمکی دے اور وہ فوراً رضامند ہو کر اسے سٹیشن پر بلاٹکٹ گاڑی میں سوار کروا دے۔ لیکن آج بسنتو نے وہ گلابی بلاؤز نہیں پہنا ہوا تھا۔ آج اس نے ڈبل کی سفید دھوتی باندھ رکھی تھی جس سے لکھمی سنگھ کو عشق تھا۔

اس وقت لکھمی سنگھ نے بسنتو کو گاڑی بانوں کی ہڑتال کے متعلق بتایا اور آلوؤں کے نہ لانے کی وجہ بیان کی۔ بسنتو کچھ دیر اپنا سر ہاتھ میں دیئے بیٹھی رہی۔ پھر وہ خشمگیں انداز سے لکھمی سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم نے ہڑتال کی مخالفت کیوں نہ کی؟"

لکھمی سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بسنتو ہڑتال کے محرکوں کو گالیاں دینے لگی۔ ان محرکوں کو جن میں اس کا اپنا لکھمی سنگھ بھی شامل تھا اور جن میں سے بخشی محض اس لئے نکل چکا تھا کہ وہ آلوؤں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لکھمی سنگھ سوچنے لگا۔ بسنتو نے ایک اچھے کامریڈ کی طرح ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب وہ بھی مجھے جواب دے رہی ہے۔ اسی وقت کرنیل گلی میں سے آیا اور باپ کو خالی ہاتھ دیکھ کر رونے لگا۔ بسنتو صبح سے اپنے باپ کی آمد کا انتظار کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو یوں روتا دیکھ کر بسنتو اور بھی زہرناک ہو گئی۔

لکھمی سنگھ کو بسنتو سے یہ امید نہ تھی۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔

"کیا بسنتو رجعت پسند ہو گئی ہے؟"

معاون اور میں

وہ گنتی میں پانچ تھے، پورے پانچ، زرد رو اور پژمردہ سے چھوکرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے جان بخش ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے اور روشنی کی ایک کرن کے لئے ترس گئے ہوں۔ ان کی آنکھیں دور تک اندر دھنس گئی تھیں اور روشنی کے انحراف پر کھڑے ہونے کی وجہ سے صرف چند تاریک سے گڑھے دکھائی دیتے تھے۔ اس سے پہلے وہ جہاں کہیں بھی تھے۔ ان کے بشرے کہے دیتے تھے کہ لاانتہا کام اور فکر نے ان کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔

بائیں طرف سے چوتھے، چق کے قریب کھڑے ہوئے لڑکے کے چہرے پر کی آڑی ترچھی لکیروں میں مجھے خود اعتمادی کے آثار دکھائی دیئے اور جہاں باقیوں کی نظریں 'آقا' کی متجسس نگاہوں سے جھینپتی ہوئی دفتر میں لٹکی ہوئی پرانی کنزیے یا ریڈ کراس کے

پوسٹر پر جم رہی تھیں۔ وہاں وہ اپنا لاغر سا چہرہ اٹھا کر ایک پُر تمکین نگاہ سے میری طرف دیکھتے رہنے کی جسارت کر رہا تھا۔ میں نے ایک چبھنے والی نگاہ سے اس کے ڈھیلے سیاہ رنگ کی اچکن پر لگے ہوئے پیتل کے زنگ آلودہ بٹنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کا کیا نام ہے؟"

"پیتمبر لال"

"تعلیم؟"

"میٹرک پاس ہوں۔ ٹائپ جانتا ہوں۔ ساٹھ کی اسپیڈ ہے۔"

—— اس کی تعلیم اور "اسپیڈ" کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے پھر ایک نظر سے پیتمبر لال کے پورے قد کو ناپا اور قدرے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں آپ نے پہلے بھی کہیں کام کیا ہوگا؟"

"اس سے پہلے میں تھوڑی سی مصوری اور پھر بلاک بنانے کا کام کرتا رہا ہوں۔ بلاک بناتے وقت جست پر شورے کا تیزاب لگایا جاتا ہے۔ تیزاب کے دھوئیں نے میرے پھیپھڑوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں نے وہ کام چھوڑ دیا۔ ایک دو جگہ اور ملازمت کی اور پھر چھوڑ دی۔"

میں حیرانی سے ان پانچوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے کوئی بھی زمانہ کی دست برد سے نہیں بچ پایا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا تیزاب کے دھوئیں نے نہ صرف اس کا بایاں پھیپھڑا ناکارہ کر دیا تھا۔ بلکہ دنیا کی خوفناک ترین بیماری اسے لگا دی تھی۔ اس بیماری کا اخفا مصلحت تھی۔ اس لئے پیتمبر لال نے حقیقت کو چھپائے رکھا۔ بہت کچھ استفسار کے بعد مجھے صرف یہ پتہ چلا۔ کہ میرے مقابل کھڑا ہوا لڑکا

ایک خوددار انسان ہے۔ کسی کی ناجائز بات کو نہیں مانتا۔ اسی لئے دو تین جگہ جہاں بھی اس نے کام کیا۔ اپنی خودداری کو ٹھیس لگنے سے چھوڑ دیا۔ اب وہ عرصہ سے بیکار تھا۔

یسوع کے وہ الفاظ "تو منصف مت بن کہ تیرا بھی انصاف کیا جائے گا" میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ جبکہ میں نے پرشکوہ الفاظ میں تمبر لال کو کہا "آپ کی اچکن کے زنگ آلود بٹن آپ کی صفائی پسند طبیعت کے داد خواہ ہیں معاف کیجئے مجھے آپ کی ضرورت نہیں"۔——— اس کے بعد مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پانچوں کو رخصت کر دیا۔

وہ زینہ سے اترتے جاتے تھے اور ایک پرحسرت نگاہ سے میری طرف دیکھتے جاتے تھے تمبر لال نے اپنا وہ چہرہ، جو میرے اظہار خیال کے بعد بہت ہی زرد ہو گیا تھا، اٹھاتے ہوئے ایک جگر سوز نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ شاید ایسی دردانگیز ٹیسیں بیسیوں ہی اٹھتیں اگر میں ذرا نمایاں طور پر اپنی ضرورت کا اعلان کرتا اشتہار چھپوا کر اخباروں میں یا شہر کی مختلف گذرگاہوں پر لگاتا۔ میں نے تو قصداً خفی قلم سے لکھ کر اپنے دفتر کے دروازہ پر چسپاں کر دیا تھا کہ ضرورت ہے ایک محنتی اور قابل کلرک کی جو پندرہ روزہ رسالہ "کہانی" میں کام کرے۔ تنخواہ بلحاظ تجربہ و لیاقت۔

نہ معلوم میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے تمبر لال کو واپس بلا لیا اور سترہ روپے ماہانہ پر اسے "کہانی" میں بطور معاون کے لے لیا۔ چند دن کے تجربہ کے بعد میں نے دیکھا کہ تمبر لال ان ملازموں میں سے تھا۔ جنہیں قدرت نے جبلی طور پر آزاد بنایا ہو۔ لیکن زمانہ کے زیروزبر نے انہیں عبد بنا دیا تھا۔ اخلاق جلالی کے مترجم نے

نے ایسے ملازموں سے اپنے بچوں کا سا سلوک روا رکھنے، اور انہیں وہی پوشاک پہنانے کی جو کہ خود پہنی جائے۔ تلقین کی ہے۔ مگر میں اس وقت ان آقاؤں سے مختلف نظریہ رکھتا تھا۔ حسب ہدایت مذکورہ مصنف مجھے تمبر لال سے ایسا سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ کہ وہ والہانہ خدمت کرتا۔ مگر میں نے ایسا نہ کیا بلکہ کبھی تمبر لال کو یہ ذہن نشین نہ ہونے دیا کہ وہ ایک نہایت قابل معاون ہے۔

میں کام کے دوران میں اکثر یہ کہہ دیا کرتا۔ کہ ایک معاون رکھ کر میں نے اپنے رسالے پر جو کہ عمر کی اولیں منازل طے کر رہا ہے ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا ہے۔

جس روز بھی میں تمبر بابو سے ایسی باتیں کرتا۔ یا یوں قدرے درشت کلامی سے پیش آتا تو اس کا لازمی اثر یہ پڑتا کہ میرا معاون ایک نہ ٹوٹنے والی خاموشی اختیار کر لیتا۔ قلم کا ایک سرا منہ میں رکھ کر غیر حاضر دل سے کسی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا اور سوچتا رہتا۔ جہاں اس سے پہلے وہ لطیف باتیں اور چست فقرے کہتے ہوئے خشک اور بے مزہ کام میں روح پھونک دیتا۔ وہاں وہ گھنٹوں خاموش رہتا، حرف بلانے سے بولتا اور اپنی خاموشی میں کبھی کبھار ایک گہری سانس لیتا۔

اس دن دفتر کی حالت بہت ابتر ہوتی۔ فائلیں الماری یا میز پر اوندھی سیدھی پڑی ہوتیں۔ شمالی دروازے سے جب ہوا کا تند سا جھونکا آتا تو کسی کھلی ہوئی فائل میں سے چند اوراق، رسیدیں، یا یادداشت کے کاغذ اڑ کر فرش پر منتشر ہو جاتے۔ خریداروں کے خطوط کچھ قلم دان کے نیچے، کچھ میز کی درازوں اور کچھ اشتہاری بیپروں میں رل جاتے۔ مسودات بڑی بے ترتیبی سے رکھے ہوتے۔ غم و غصہ سے کانپتے ہوئے

گرہن

نمبر ۲ بابو کے کمزور ہاتھوں سے تھوڑی سی بہت سیاہی میز پوش پر گر کر آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔ کرسیاں جن پر افسانہ نویس آکر بیٹھتے عجیب بے ڈھنگے طور پر پڑی ہوتیں۔ اپنے افسانے کی تعریف میں ایک آدھ کلمہ سننے کے عادی افسانہ نویس دفتر کی حالت کو دیکھتے اور اپنے شنوائی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر چل دیتے پھر وہ مہینوں اپنے نادر افکار نہ بھیجتے۔ بعد میں مجھے ان کے سامنے گڑگڑانا ہوتا۔ بکھرے ہوئے ردی کاغذ جنہیں میرا اسٹاف اپنے معاون عام طور پر اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا کرتا تھا۔ ویسے ہی بکھرے پڑے رہتے اور دفتر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہوتا جیسے اس دن ہم غیر معمولی طور پر مشغول رہے ہیں۔ گویا جذباتی ایڈیٹر کسی معرکتہ الآرا کہانی پانے پر بستر کے ارد گرد ناچتا رہا ہے اور شاید جذبات سے مغلوب ہو کر کاغذوں، مسودوں، فائلوں کو اٹھا اٹھا کر چھت کی طرف پھینکتا رہا ہے۔

چمبر لال کا اشتہار فراہم کرانے کا طریقہ بالکل نیا تھا۔ وہ مارکیٹنگ کے طریقے، اقتصادی حالات، مقامی باشندوں کی معاشرت اور ان کے خرچ کرنے کی اہلیت سے واقف تھا نفسیات پر فطری طور پر دخل رکھنے کے سبب وہ کمائی کے سب سے گمنام اور سستے ذریعے کے لئے اشتہار فراہم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بلاک بنانے اور چھاپہ خانہ میں کام کر چکنے کی وجہ سے وہ طباعت کے عمل اور انگریزی ٹائپ کے رخ کو بھی جانتا تھا۔ وہ اشتہار کو باقاعدہ دو یا تین حصوں میں تقسیم کیا کرتا مصور کے حصہ کا کام وہ ایک خاص مصور کو دے کر حسب پسند کام لینے کے علاوہ کمیشن بھی اینٹھا کرتا۔ ایک دفعہ تو اشتہاری مضمون اور تصویر کے سیٹ کروانے کی سر دردی بھی اس نے مول لے لی۔

کسی دوست کی وساطت سے پچھلے ماہ اس نے چند ماہ کے لئے ریویو کا مکمل صفحہ کا اشتہار لاکر خاصی آمدنی پیدا کر دی تھی اور وہ آمدنی اوائل عمر میں 'کہانی' کو ایک بہت بڑی مدد تھی۔ اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ تمبر لال نے 'کہانی' میں جان ڈال دی تھی۔ اس کی محنت ہی رسالہ کی کامیابی تھی۔ اس کی استعداد کی وجہ سے مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کہ تمبر لال کہیں دفتر چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے۔ چونکہ وہ خود بھی لکھنا جانتا ہے اور اشتہار بھی فراہم کر سکتا ہے۔ کہیں وہ اپنا ہی کوئی رسالہ نہ نکال لے۔ چنانچہ اسی خوف کے رد عمل نے مجھے پیش قدمی پر مجبور کر دیا۔ میں نے کہا۔

"بابو تمبر لال۔ تم اپنا ہی کام کیوں نہیں چلا لیتے۔ . . . . میں جانتا ہوں تم کام اچھی طرح سے نباہ سکتے ہو، معقول آمدنی کا ذریعہ پیدا کر سکتے ہو اور پھر . . . . جب کہ تمہاری ساکھ کی اسپیڈ ہے"

پھر میں نے خود ہی کھسیانہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اور . . . . اور . . . . مجھے ایک معاون کی ضرورت بھی تو نہیں رہی"

تمبر لال اس جملے کو متعدد بار سن کر تنگ آ چکا تھا۔ اس لئے ٹپٹاتے ہوئے بولا۔

"ضرورت نہیں۔ تو مجھے بار بار کیوں سناتے ہیں آپ؟ کیوں نہیں مجھے . . . . . ."

اور بغیر بات کو مکمل کئے تمبر لال خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ جیسے وہ تلخ حقائق سے دوچار ہونا تو کجا اس کے تخیل سے بھی گھبراتا ہو۔ میں جو کہ دراصل اس کی علیحدگی کو بغیر اپنے آپ کو گزند پہنچائے گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ یوں کانپ اٹھا۔ جیسے مجھ پر یک لخت کسی نے سرد پانی انڈیل دیا ہو۔ میں نے اپنی بات کو بدلتے ہوئے کہا۔

"آج کل تو ضرورت ہے۔ مگر مستقل طور پہ تو نہیں۔ بابو۔ بابو۔۔۔ میرا مطلب سمجھ گئے تم؟"

پھر مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا میری بات تشنۂ تکمیل ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔

"میرا مطلب ہے۔ تم کیوں اپنا کام چلا کر ایک معقول آمدنی کا ذریعہ نہیں بنا لیتے؟"

بظاہر میں نے وہی بات دہرائی تھی۔ لیکن اسے کہہ دینے سے میں نے دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھا دیا تھا۔

میرے معاون نے اپنا زرد اور فرطِ غم سے بھرا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اسے کھانسی شروع ہو گئی اور ایک کانٹا سا اس کے گلے میں کھٹکنے لگا۔ اس نے منہ اور ناک پر رومال رکھ لیا۔ تاکہ ہوا مجھ تک چھن کر آئے۔ پانچ منٹ تک آہستہ آہستہ مگر لگاتار کھانستے رہنے سے بابو تمبر لال کراہنے لگا۔ جب ذرا دم سیدھا ہوا تو اس نے بائیں ہاتھ سے چشمہ اٹھا کر پیشانی پر سرکا دیا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"لیکن کام کے لئے کچھ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تعجب ہے کہ تم اکیلی جان ستر روپے خرچ کر ڈالتے ہو"

پمبر لال نے بات کرنے کے لئے حلق میں کھٹکنے والے کانٹے کو انگوٹھے سے دبائے رکھا اور نتھنے پھلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کو کس نے بہکا دیا کہ میں اکیلا ہوں۔ میری ایک بہن ہے، شادی کے قابل! اور ایک بیوہ بوا ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ گو ماں باپ مر چکے ہیں . . . . . اور جناب! شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ آٹھ آنے کا تو وہی پالش آتا ہے جو کہ اچکن پر لگے ہوئے بٹنوں میں چمک پیدا کرتا ہے"

اور اس بات کو سخت نفرت سے کہنے پر پمبر لال ذرا بھی نہ جھجکا۔ اس کے بعد اس نے اپنا دبلا پتلا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ پہلو سے روشنی کے خلاف پمبر بابو کی پروفائل بہت ہی مہیب دکھائی دیتی تھی۔ اس نے بات کیا کی۔ مجھے ایک چپت لگا دی۔ جس سے مجھے بغیر چارہ نہ تھا اور ابھی تو اس نے ذاتی خرچ کی ایک مد ہی بتائی تھی اور پھر اس کی بہن جو سکول میں پڑھتی تھی . . . . . اور بیوہ بوا . . . . .

میں نے دل میں خیال کیا کہ میں نے اس نوعمر چھوکرے سے بہت کچھ سیکھنا ہے اپنی تمام خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ وہ مجھ سے کہیں بڑا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ میں اس کا نوکر معلوم ہوتا ہوں۔ اس کے انداز گفتگو پر مجھے غصہ محض اس لئے آیا۔ کہ آخر میں آقا تھا

اس کے بعد میں نے پمبر بابو کو کچھ نہ کہنا چاہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ اس کے خلاف طبیعت کوئی بھی بات ہوتے پر فضا مکدر ہو جائے گی اور میرے دل کا چین

اور راحت چند گھنٹوں کے لئے بالکل فنا اور برباد ہو جائے گی۔ تمبر لال کے تمام دن کبیدہ خاطر رہنے اور کام میں دلچسپی نہ لینے سے تمام فائلیں میز پر کھلی پڑی رہیں گی۔ وصول کرنے والے بل وصول شدہ بلوں میں پروئے جائیں گے۔ نئے آرڈروں والی چٹھیاں تعمیل شدہ آرڈروں کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں جا پڑیں گی۔ لکیریں کھینچنے کے لئے فٹ رول باوجود کوشش کے نہ مل سکے گا۔ ڈاک خانے میں جانے والے وی۔ پی۔ پیکٹ پر کوئی رقم اور فارم منی آرڈر پر مختلف رقم لکھے ہونے پر ڈاک خانے کا ہیڈ سب پوسٹ ماسٹر جھنجھلا کر تمام وی۔ پی واپس کر دے گا تاکہ دفتر میں جا کر درست کرائی جائیں۔ ان تمام باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے چپ ہی مناسب سمجھی۔ یہ نہ صرف تمبر لال کے لئے اچھا تھا۔ بلکہ میرے اپنے لئے بھی۔ محض ذاتی مفاد، خود غرضی سے میں خاموش رہا اور میں اتنی دیر چپ رہا کہ مجھے گھٹن سی ہونے لگی۔

کچھ عرصہ بعد میں نے کہا "بابو۔۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں کہ منی آرڈر کے کوپنوں کا اندراج کرو تب تک تم سوئے رہو گے۔ خود بخود نہ کرو گے کیا؟"

تمبر لال نے جواب دینا چاہا۔ مگر اسے چھینک آ گئی اور پھر ہلکی ہلکی کھانسی شروع ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ تو سانس لینے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ بات کیا کرتا۔

اس بار وہ ہفتہ بھر خاموش رہا۔

تمبر لال کی شخصیت نے ہی دراصل مجھ میں احساس ذات پیدا کر دیا تھا ورنہ اس سے پہلے زندگی کی مختلف دوڑوں میں مجھے کئی ایک خوشگوار اور ناخوشگوار ملازموں سے پالا پڑا تھا لیکن کسی کے سامنے مجھ میں آقا پن کی نمو اتنی شدت سے نہ ہوئی تھی۔ حقیقت تو

یہ ہے کہ یہ میرا اپنا ہی احساس کمتری تھا جو بہروپیا بن کر مجھے ستاتا تھا۔

کچہریوں کے اشتہار حاصل کرنے کے لئے میں نے پچھلے ماہ چند ایک اضلاع کا دورہ کیا تھا اور منصفوں کے سامنے اشتہار حاصل کرنے کے لئے گڑگڑایا تھا۔ لیکن اب تک صرف دو اشتہار ملے تھے ان میں سے ایک سینئر سب جج گورداسپور کا تھا جو کہ شریف اور خلیق جج نے اسی وقت دے دیا تھا اور دوسرا تحصیلدار صاحب موگا کا تھا جنہوں نے عنقریب ہی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

دسمبر کا آغاز تھا اور میں جانتا تھا کہ کرسمس کی گیارہ چھٹیاں ہو جانے پر ان سرپرستوں کی طرف سے پھر ہماری طرف کوئی بھی متوجہ نہ ہوگا۔ اس لئے میں کچھ گھبرا سا گیا۔

ان دنوں تمبر لال کچھ خوش تھا۔ میں نے احتیاطاً چند دنوں سے اپنے آپ کو اس کے راستہ میں آنے سے باز رکھا۔ وہ کاغذ کو اوپر نیچے کرتا ہوا سیٹیاں بجاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ "دیتا" کی لاٹری سے اسے تیس روپے آئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کا معترف تھا۔ کہ ان روپوں کے تصرف کے متعلق سینکڑوں خیالوں نے اس کے ذہن کو پریشان کر دیا تھا اور اس کی نیند چھین لی تھی۔ اگر کوئی بات صحیح معنوں میں اسے سکون دیتی تھی۔ تو وہ یہ کہ اس کی بہن سکول سے نکلتے ہی ایک زنانہ صنعتی سکول میں چھوٹی لڑکیوں کو سلائی اور کروشیا سکھانے پر نوکر ہو گئی تھی اور اس وجہ سے تمبر بابو کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی خوشی کو دیکھ کر مجھے عدالتی اشتہاروں کا خیال بھی بھول گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیوں . . . . . کیا بات ہے بابو؟"

"نہیں . . . . . یونہی . . . ." تمبر نے گدگدی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد تمبر نے دو ایک چست باتیں کہیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا "یہ بہت

اچھا ہوا جو تمہاری بہن صنعتی سکول میں جانے لگی ہے۔ کیا مشاہرہ ملے گا؟"

ایک پُرغرور انداز سے تمبر بولا "پچیس روپے ماہانہ . . . . مجھ سے بھی آٹھ روپے زیادہ۔"

اس وقت مجھے یوں دکھائی دیا۔ گویا فضا میں ایک خلاء سا پیدا ہو گیا ہے۔ جسے پُر کرنے کی اشد ضرورت ہے اور کمرے کی تصویریں اور کیلنڈر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں اور میز پر پڑا ہوا قلم دان اپنی جگہ سے بہت دور سرک گیا ہے۔ کتابیں قدرے بے ترتیب رکھی ہوئی ہیں۔ اور سب کچھ میرے ایک معمولی اشارے سے اپنی اپنی جگہ پر چلا جائے گا اور پھر میرے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے کو کہتے ہوئے پایا۔

"اب تو تم اپنی مشترکہ آمدنی سے کوئی اخبار جاری کر سکتے ہو۔"

تمبر لال نے ہنسنا بند کر دیا۔ وہ بہت رنجیدہ بھی نہ ہوا۔ گویا وہ میری ناقابل اصلاح طبیعت سے مانوس ہو چکا ہو۔ صرف چند ایک تیور اس کی پیشانی پر نمودار ہوئے اور وہ کھانستے ہوئے بولا۔

"کہاں؟ ———— اس کی تنخواہ تو ہم اس کے بیاہ کے لئے اکٹھی کیا کریں گے۔"

پھر جیسے تمبر کو کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ وہ کٹ کر اٹھا اور برآمدے میں جا کر اپنی خفگی کو سگریٹ کے دھوئیں سے پیدا ہوتے ہوئے حلقوں میں جذب کرنے لگا۔ اس کی میز پر بہت سے کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ گویا وہ ابھی ابھی کچھ لکھتا رہا ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک سرسری نظر ان کاغذوں پر ڈالی اور مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرانی اور کچھ

محسوس ہوتی کہ عدالتی اشتہاروں کی بات جو چند دنوں سے مجھے سراسیمہ کر رہی تھی۔ چمبر بھی اس کا حل سوچنے میں مصروف رہتا۔ لیکن وہ چٹھیاں جو اُس نے دلیری سے منشیوں کے نام لکھی تھیں۔ ان میں دوستانہ طریقہ تخاطب کو میں نے پسند نہ کیا۔ میں نے یہ آہستہ سے چمبر کو بلاتے ہوئے کہا۔

"چمبر جالو! دیکھو نا۔ منصف اور جج کا عہدہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان سے ایسا دوستانہ تخاطب کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

بابو اس انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ گویا اُس کے سامنے کوئی نیپٹ گنوار کھڑا ہو۔ اور بولا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے پر کچھ بھی اعتماد نہیں ہے۔ آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ جرنلزم کتنا ارفع پیشہ ہوتا ہے اور سماج کے کتنے بڑے بڑے ادنیٰ اخبار والوں کے دستِ تعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور پھر ایک دکاندار کی حیثیت سے تو یہ لوگ پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ . . . . . ان لوگوں کے سامنے ہمیں غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ان لوگوں سے ایسے ہی تعلقات پیدا کرنے چاہئیں تو یا ہم رتبہ میں ان سے کسی طرح بھی کم نہیں۔"

"کچھ بھی ہو" میں نے اپنی بات کی رٹ لگاتے ہوئے کہا "میں اس طرز تخاطب کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ تم ہی دیکھ لینا۔"

اس کے بعد میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن چمبر کا چہرہ سنجیدگی اختیار کر گیا۔ اس لئے میں دُور کرنا موزوں ہوا۔ ۲۶ر دسمبر تک ہمیں چھ عدالتی اشتہار موصول ہو گئے۔

X X X X X X

تمام وہ لوگ جو کسی ملکی مفاد کے لئے شب زندہ داری اختیار کرتے ہیں۔ ان کی بیویاں اعلانیہ طور پر نہیں کوستی رہتی ہیں تاوقتیکہ اپنی محنت کے اجر کا خوبصورت سائنبل جس میں خوب صورت ساڑھیاں بھی دکھائی دیں اور بچوں کے لئے گاڑی بھی۔ ان کے سامنے پیدا نہ کیا جائے۔ وہ شب زندہ داری سے متفق نہیں ہوتیں۔ میری بیوی کی ناراضگی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ میں اسے یہ بھی نہ بتا سکتا تھا۔ کہ صبح فلاں سبزی پکائی جائے اور شام کو فلاں دال اور پھر ایسی بات پر اکثر گھر میں ناخوشگوار سی جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ آج میں گھر سے ہی جھگڑ کر سونے کے لباس اور سلیپر چپل میں دفتر چلا آیا تھا اور روٹی بھی وہیں منگوالی تھی۔

روٹی کھاتے وقت مجھے یہ خیال ستا رہا تھا۔ کہ آٹا بھی ختم ہے اور گھی بھی

——— اور شام کو کیا سبزی پکائی جائے؟

وائے قسمت آج تمبر لال پھر خاموش تھا۔ نہ معلوم اس ذکی الحس شخص کے جذبات کو کس نے ٹھیس لگائی تھی۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ کم از کم اس دن میں نے تو اسے کوئی رنجیدہ کرنے والی بات نہ کہی تھی۔ آج وہ گھر سے ہی ایسے آیا تھا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تمبر بابو کی بہن مسلسل بیماری کی وجہ سے صنعتی سکولوں کی ملازمت سے علیحدہ کر دی گئی ہے۔ تمبر کے پاس جو کچھ تھا۔ وہ سب کچھ دوا دارو پر ختم ہو گیا۔ اب اس کے پاس علاج معالجہ تو ایک طرف پیٹ کی آگ خاموش کرنے کے لئے بھی کچھ نہ تھا اور وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ بعض وقت بدنصیب انسان کو قدرت محض اس لئے کچھ دیتی ہے تاکہ پھر اس سے چھین لے۔ قدرت اپنی حزنیہ تمثیل کو مقام اوج تک پہنچانے کے بہت سے طریقے جانتی ہے۔

گرہن

اُس دن بھی میں تمبر لال سے خائف' ایک کونے میں دبکا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا " میں تمبر لال سے اتنا خائف کیوں ہوں؟ . . . . آخر وہ میرا نوکر ہی ہے نا "

اس کے بعد ایک زبردست ردِ عمل ہوا میں یہ بھی بھول گیا۔ کہ تمبر دو دن سے بھوکا ہے۔ میں نے مڑ کر کہا۔

" بابو . . . . . . آج شام کو کچھ سبزی اور آٹا تو میرے گھر پہنچا آنا . . . . پیسے میں دیتا ہوں "

اور میں نے اس کا جواب سنے بغیر پیسے میز پر رکھ دیئے میں نے یہ محسوس کیا۔ کہ اگر تمبر لال کی جگہ کوئی اور دفتر کا ملازم ہوتا۔ تو شاید میں اس سے یہ کام کبھی نہ کہتا . . . . . تمبر لال حیرت سے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا رنگ زرد ہونے لگا۔ شانے پھڑکنے لگے۔ وہ بولا۔

" لیکن جناب ——— آپ نے دفتر کے کام کے لئے مجھے رکھا ہے . . . . نہ کہ گھر کے لئے۔ معاف کیجئے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا "

میں نے کہا " کام صرف پندرہ منٹ کا تو ہے اور میں تمہیں دفتر کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے چھٹی دیتا ہوں "

" خواہ دو گھنٹہ کی چھٹی دیں۔ یا دفتر کے وقت کے دو گھنٹہ بعد تک بٹھائے رکھیں۔ لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو گا "

" آخر اس میں حرج بھی کیا ہے؟ "

" دفتر کے کام اور گھر کے کام میں بہت فرق ہے؟ "

"فرق ہے!" میں نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔ "آپ جان بوجھ کر رزق کو دھکا دے رہے ہیں۔"

"بے شک" مجھے دلیرانہ جواب ملا۔

"کل مہینہ ختم ہوتا ہے۔ براہ مہربانی اپنا بندوبست کر لیجئے۔"

اس وقت میری نظر 'کہانی' کے تازہ ترین شمارے پر پڑی۔ اس میں آدھا ہیڈنگ میٹر تھا اور آدھے اشتہارات، اور یہ جو کچھ بھی تھا، تمبر لال کی محنت کا نتیجہ تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب کہانی کے رنڈاپے کے دن آ گئے۔

اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ تمبر لال کے سامنے اپنے رویے پر اظہار معذرت کروں اور اسے کہہ دوں کہ وہ بات صبح کے ناخوشگوار واقع کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ لیکن . . . . آقا . . . . . نوکر . . . . .

میں اسی بات کو سوچتے ہوئے برآمدے میں چلا گیا۔ پیچھے سے میں نے قفل لگنے کی آواز سنی اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے چابی تالے کے قریب پڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس وقت تمبر بابو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بازار کی طرف ہو لیا۔

اس وقت میں کتنا ہی نوکری چھوڑنے کا خیال تمبر کے ذہن میں پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بآواز بلند پکارا۔

"تمبر . . . . تمبر بابو، چابی لینا بھول گئے تم؟"

تمبر چلتا گیا۔ میں نے سوچا۔ کیوں نہ میں آقا پن کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دوں۔ اسی سونے کے کپڑوں اور سلیپروں میں اس کے پیچھے دوڑ جاؤں اور گڑگڑا کر معافی مانگ لوں۔ راستے میں میرا سلیپر کیچڑ میں دھنس کر رہ جاتا ہے۔ تو رہ جائے۔ کسی کار کے پائدان

سے ٹکرا کر سیڑھی پر اوندھا گر پڑتا ہوں اور میرا سر پھٹ جاتا ہے تو پھٹ جائے۔
آخر آقا پن اس سے کم ذلیل ہونے پر تھوڑے ہی معدوم ہوتا ہے۔

اور جب میں نے دوڑنا چاہا تو میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ موٹر پر بیٹھتے
ہوئے تمیز نے صرف ایک دفعہ میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ . . . ”یہ ٹھیک
ہے میں بھوکا مر رہا ہوں، لیکن اپنی جیب میں کسی کی چابی کا بوجھ مجھ سے کبھی
برداشت نہ ہو سکے گا۔“

چیچک کے داغ

اب وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کسی کی تنقیدی نگاہ نہیں پہنچتی تھی ——
لوہے کے بڑے کیلوں والے بلند شہری پھاٹک کے پیچھے، جہاں ڈھوروں کا سارا گوبر بکھرا پڑا تھا اور اس کی بدبو، اگر کی دھند کی طرح، سطح زمین کے ساتھ ساتھ تیر رہی تھی جہاں اس کی بہن ایک بغل میں، گلی کی کسی زچہ کے لئے گائے کا پیشاب تھامے رہی تھی . . . .
لیکن سکھیا نے تو، ان کا منہ، پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ اس پر چیچک کے بڑے بڑے اور گہرے داغ تھے جیسے اس کے میکے ماتن ہیلی کی موٹی ریت پر بارش کے بڑے بڑے قطرے پڑے ہوں۔

اس نئے گھر کا رہن سہن کتنا پرانا تھا اور یوں بھی کچھ سوجھ والے ہاتھوں کا محتاج —— دیواروں میں رنجیت شاہی چھوٹی اینٹیں، بوڑھے کالے کے دانتوں کی طرح،

اپنے مرے ہوئے جبڑوں میں علیحدہ علیحدہ اور باہر ابھری ہوتی تھیں۔ دیواروں کی ٹیپ ——— سن، ماش اور چونا برس ہوئے اڑ چکا تھا۔ ایک دیوار پر مٹی اور بھوسہ ملا کر لیپن کیا گیا تھا۔ پھر اس پر چونا پھیر کر، گیردے رنگ سے، بڑے بڑے اور بدزیب ناگری حروف لکھ دیئے گئے تھے۔ بھنڈارے کے قریب اہنڈیا پر پھریا بیٹھی ایک بے محل اور بے سرا گانا گا رہی تھی ——— اپجس (گناہ) کی مت باندھو گھڑیا.. ... بے چاری پھریا! وہ ان گناہوں پر نادم ہو رہی تھی جو اس نے کبھی نہیں کئے تھے، جو وہ کرنے کے اہل ہی نہ تھی۔ یا شاید وہ یہ گانا اس لئے گا رہی تھی کہ چھوٹے لالا کی شادی پر اسے بہت تھوڑا لاگ ہوا تھا۔

"ارے او لالا! تو کیوں کھڑا ہو رہیا گوبر ماں؟"

گھر کی اماں نے آواز دی۔ اس وقت بڑا لالا ناریل کا دم لگاتے ہوئے صحن میں کھڑا اماں پر ہنس رہا تھا ——— اب رام نام کے بعد میّا نے گئی کر دی۔ بھلا کیا لابھ اس پوجا پاٹ سے؟ رام نام ہی گئی کر دیا۔ واہ ری اماں!.... چپ رہے، گھر کی اماں نے ایک بھونڈی مسکراہٹ سے کہا اور پھر پوجا کی آخری قسط پوری کرنے کے لئے بڑھیا نے پیتل کی ٹوٹی سی لٹیا اٹھائی اور صحن کے مہوت برہمن ——— پیپل کے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے پاؤں پر برف کا سا ٹھنڈا پانی گرا دیا پیپل کانپ اٹھا۔ شاید یہ ہوا جھونکا تھا۔ پھر پیپڑ کے گھیرے میں مولی کا سرخ اور زرد تاگا لپیٹ دیا۔ بڑے لالا کا چھوٹا لالا بہت نٹ کھٹ تھا۔ اسے چھوٹے بڑے، گلی گواہنڈ کے سب صاحب کہتے تھے گھر کے سب لوگوں کے احتجاج کے باوجود اس نے ایک میاں پلہ پال لیا تھا اور باپ دادا کا غم بھرشٹ کر دیا تھا۔ صاحب اٹھا

تو پیر بھی ساتھ ہی۔ اٹھتے ہی پلّے نے انگڑائی لی، منہ کھولا، زبان مچکائی، دھواں سا اڑایا اور صحن کے پیپل کے چرنوں میں پہنچ، ایک ٹانگ اٹھا، اپنے واحد طریقے سے پوجا کر ڈالی۔

سکھیا کے سر میں رات کے سومیل کے چکر باقی تھے۔ لاری کی گھوں گھوں جھر ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اسے گھیرے آ رہے تھے۔ بڑی نند نے چینی کی ایک پلیٹ میں لیموں کا اچار لا رکھا تھا۔ "آ، ہا چھی! سکھیا نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ چینی کے ٹنڈر استعمال کریں۔ انہیں جھوٹے برتنوں میں کھانا کھاویں۔ ملیچھ مسلمانوں کی طرح ——— بھی! اچھی بہن! جا تو ذرا، سکھیا نے قریب بکڑ کالان کی، بھابی کو کہا۔ کوئی مراد آبادی کٹورا نہیں تمہارے یہاں؟ اس میں تو لے آ، تھوڑی سی چاٹ، متلی رک جائے۔ ذرا میں چینی دینی کے برتن میں نا کھاتی ——— اور دولہن ناک چڑھا ابکائیاں لینے لگی۔ بڑی نند جی میں خوش ہوئی ——— اماں تو بوڑھی ہو گئی۔ وہ تو جھوٹے برتنوں اور دوسروں میں فرق کیا دیکھے گی لیکن یہ ——— اب ہاں نیا کا کھویا آ گیا گھر ماں!

نند نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور ٹل گئی۔ بلند شہری پھاٹک کی اوٹ میں کھڑے وہ سکھیا کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انگریزی طرز کے بال کٹا رکھے تھے۔ نند کہہ رہی تھی، لکھنؤ سے بی، آ پاس کیا جیرا ہے انہے۔ گھر سے پرے شہر میں، کنواروں کے مکان (بورڈنگ) میں رہتے تھے۔ جینئو بھی نا پہنتے۔ سر پہ چوٹی بھی نا رکھتے۔ سکھیا نے جی میں کہا، "یہ ملیچھ ہو دیا ہے نا ——— یہ رنگریزی (انگریزی) اور پھر ان چیچک کے داغوں کو کیا ہوگا؟ جب یہ خوفناک منہ قریب آئے گا تو طبیعت بہت گھبرائے گی۔

اور کوئی لیموں کا اچار، کام نہیں آوے گا۔ سب ٹھسورہے ہوں گے، سب کچھ مجھے اکیلے
ہی بھگتنا ہوگا۔ کیا دیکھا ان لوگوں کا چاچا نے ہے مجھے گھورنرک (دوزخ) میں دھکیل
دیا اور پلنگ پر پڑی سکھیا سر زانوؤں میں دبا رونے لگی۔

محلہ بجازی کی عورتیں (رنگی) ٹک دلہن کا گھر اکھوٹا پوچھنے آ رہی تھیں۔ دلہن بکھری
تھی، پانے کا سونا جیسا (دھرم) کا شریر میں گھوٹل جاتے۔ اسے منہ بسورتے دیکھ کر آپ
بھی منہ بسورنے لگیں ——— سچ ہے اس پاپ بڑی دولت ہے کیسے چھوٹ
جائیں ایک دن میں؟ ایک عورت بولی، جب میری شادی ہوتی تھی تو ——— اس
کے بعد وہ عورت سکھیا سے لگی: وہ نے سسکیاں لینے لگی سکھیا حیران تھی۔ اس نے
اس وقت تو ماں باپ کو یاد نہیں کیا تھا اور اس ادھیڑ عورت کا نچلا ہونٹ اوپر کے
ہونٹ کی طرح لٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس ادھیڑ کو آپ ہی یاد شادی رسم کے
گھر روٹی کا آنگن محسوس ہونے لگا۔ اپنے دوپٹے سے جس سے آنکھوں کا سیل
پونچھا ——— دنیا کی یہ ریت چلی آتی ہے، بچو! آج سکھ پیار کا مانگ، اتھانے سے
کا کا تو گنو بہت دیا اور بھرم تو بیٹیوں جیسا دیا ہے۔ جہاں کہاں ہے مستوری:
رات کو رات کہتا، دن کو دن ——— اچھا گھر ہے، اب مار ہے!

آج بڑا شبھ دن ہے۔ گھر کی اماں بولی۔ گئی تھی چھا مرتو ہے نا۔ اس کے ہاں
بالا ہوا۔ تیرہ دن ہوتے بیٹا بہو کی کے ہاں بیٹا ہوا۔ تبھی وہ آج گنگا تیرتھ دکا گاسے کا
بیٹا ساپ، بھلا وسے کے لئے لے گئی۔ یہ اصل بیٹوں کی ہے، بیٹیوں کی پہار ہے اور
شنوبوں کی۔ ادھر بیٹا ہوا، ادھر شادی ہوئی۔ ورکا سمدھی کی ماں سکار رہا تیرا
صاحب؛ بڑی بہو گھر آئی تو تم نے تیرا صاحب گدی کو ڈالا تھا۔ اور پھر تلے بیٹی دیئے

ہوئے منجھلی کی گودی میں بٹھایا تو پٹک سے پہلے سال لالا اور دوسرے سال ہو۔ لیکن بٹو کا بری ہے۔ لالا سنے بھی زیادہ ہو ہوئے۔ گودی ہری چھنے اور کہاں ہے وہ؟ ہاں اسے دلہن کی گود میں بٹھاؤتی ہوں۔

سلکھیا گٹھڑی ہو گئی ——— بیٹا اور چیچک کے داغ!

گوجو ڈھور کھود لینے کے لئے آگیا تھا اور ایک میلی لنگڑ ہنگوٹا کس صحن کو پھاوڑے سے صاف کر رہا تھا۔ دھند شرماتے ہوئے سورج کی کرنوں میں حل ہو رہی تھی۔ اور بدبو کو کین سکھ پیج نے سمیٹ لیا تھا۔ دھند کا گھونگٹ اٹھتے ہی صبح کا چاند سا مکھڑا دکھائی دینے لگا۔ قصبے سکے پھیرے سے ہٹ کر پنجابیوں کے ہاں اور ادھر گانے بجانے چلے آئے۔ اس وقت امرتو کے ہاں جمعدارنی سر پر باندھ رہی تھی۔ سلکھیا سبھی کچھ دیکھتی تھی لیکن اسے سب کچھ کاٹنے کو دوڑتا تھا۔

صحن کے دھیمے جانے سے یہ پہلے اور بٹو کو چمکاتے ہوئے بڑے بھیا کے پاس چلے آئے۔ لیکن یہاں بھی یہی دکھائی دیتا تھا جیسے چھپ رہے ہیں اور اپنا چیچک سے بھرا بھرا چہرہ خود ہی دکھانے سے ہچکچاتے ہیں۔ سلکھیا کے دل میں کچھ رحم سا پیدا ہو گیا۔ رام کسی کو بدصورت بھی نہ بنائیں۔ اپنے آپ سے شرم آتی ہے۔ مانتی ہوں، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن میرا کیا قصور ہے؟ میری شکل سے تو چڑیلیں جتنی تھیں اور ان کی شکل سے خوبصورت بھی نا جلیں۔

بڑی نند مراد آبادی برتن میں اچار لے آئی۔ سلکھیا نے اپنی پتلی پتلی انگلیاں کشمیری فرد سے باہر نکالیں اور اچار کی طرف بڑھائیں۔ نند نے بھائی کی انگلیاں دیکھیں۔ اور پھر اپنی دونوں گڑمیں سے ڈھنڈری کی انگلیاں! اور بولی۔ جے رام نے تو کوئی موتی دان کئے ہیں پچھلے جنم میں۔

سسر سول کی نازک سی ناک اور لانبی انگلیاں ہیں سچ بتا سکھیا بھابی۔ کون سانچے میں ڈھالی تھیں تم؟
اتنا پریم! سکھیا سوچنے لگی۔ یہ رشتے ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔ آپ ہی آپ اتنا پیار ہو جاتا ہے۔ اس کی خاطر سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے۔ اس کے لیے ساس سسر، جیٹھانی، دیورانی، نندیں، نندوئی سبھی کی سننی پڑتی ہے لیکن جب وہی ایسی صورت کا ہو تو کس کا جی لگے گا ادھر؟ ——
افیم کا گولا کھا سو رہا ہے!
"تو تم [illegible]؟" نند نے پوچھا۔
سکھیا چپ رہی۔ وہ اس رسم کو ادا کرنے سے شرماتی تھی۔
نند نے سکھیا کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور منہ کو اوپر اٹھا دیا۔ آنکھیں بند تھیں۔ جیسے مست رس آ رہا ہو۔ ہونٹ سیب کی طرح ملے ہوئے تھے۔ ابروؤں کی کمان کھنچی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ نند نے کہا۔
"اچھی! ایک بات بتا!"
سکھیا نے سوال کی صورت میں آنکھیں کھول دیں۔ نند نے ادھر ادھر دیکھا سب عورتیں اپنے اپنے کام میں مشغول تھیں۔ "کیا جیرام نے تجھے دیکھا ہے؟" وہ بولی۔ سکھیا کا جی چاہا کہ وہ پوچھے۔ کون جیرام؟ اور پھر مزا رہتے لیکن اس نے منہ پر سے ہٹا لیا۔ نند کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔
نند ایک دیہاتن تھی اور زیادہ طاقتور۔ اس نے دلہن کو سکوت نہ دیا۔ اور پھر اپنا سوال دہرا دیا۔ سکھیا نے جان چھڑانے کے لیے ہاں میں سر ہلا دیا۔
اسی اثنا میں شادی کے سلسلے میں کسی رسم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شاید بیٹی کو کنگن باندھنے تھے۔ برات کے [illegible] کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ کالا مہمان گھر سے آ گئے تھے۔ اس کے لیے ہی [illegible] تھے۔ سکھیا ایک مٹھی میں چنے بھر کر نکال لیے۔ نند نے بتایا، بوکا

گرہن

ہاتھ بہت نازک ہے۔ کاکا جی کا جی بہ خوش ہو گئے۔ ایک ہاتھ میں بہو زیادہ سے سا ٹھ روپے نکال لیے تھی۔ کاکا سے قریب نہ جانے کی کھڑا تھا۔ وہ گھر کا داد وتھا جو ٹانڈے ویزن کا حریف نہیں آ پایا تھا۔ اس نے رمی نے سر پر مسل کو پہنا ایک دکان بیٹھا ہے۔ تھا نیچے میا مرخ وہ بھی بیٹھے گا اور گھر میں آدھی دھوتی سے لئے بہت مسکرا کر بنا دیا تھا گھر کا داد جو رمی کی وجہ سے اس کی بہت پوچھ ہوتی تھی۔ ورنہ وہ فوراً گھر جاتا تھا اور کئی معتبر آدمی اسے گرنے بہت ہی ڈرتے تھے۔ ایک جیرام اس سے نہیں ڈرتا تھا۔ اسے رمی کے وجود سے شرم آتی تھی۔

سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے سکھیا کے کوٹھے کی کھڑکی سے دور تک اونچ نیچ اور سبزی کی ان ڈھکی جگہ چادر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ ان ٹیلوں کے قریب گھر کھیت کی پھیری سرکی ہوئی انگیا سی بن گئی تھی۔ زمین اپنی عریانی کو چھپانے کے لئے دھندلی چادر کھینچتی تھی لیکن سورج اس کی ساری چادر کو کھینچ لیتا تھا۔ آخر زمین بے بس ہو کر پڑی رہی۔

مرد اب اور قریب آ گئے تھے اور سکھیا انہیں اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔ وہ دو منٹ کے قریب ایک ٹک جیرام کو دیکھتی رہی۔ جیرام کی ایک عجیب عادت تھی۔ وہ ہر دو تین منٹ بعد سر کو ایک جھٹکا سا دیتا تھا۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو نہ ادھر آ جاؤ۔ شاید اسی لیے جیرام کے قریب نہیں جاتا تھا۔ دو منٹ دیکھنے سے سکھیا کی نظر دل میں ہی جھپک گئی اس کے دانت گئے اور جیرام کا چہرہ بے عیب دکھائی دینے لگا۔ سکھیا سوچنے لگی جب بڑی دیر دیکھتے رہنے سے وہ چہرہ صاف دکھائی دینے لگا ہے۔ ساری عمر ساتھ رہنے سے شاید یہی منہ اتنا ہی خوبصورت ہو جاتے کہ چھپ کے داغ دیکھنے سے بھی دکھائی نہ دیتا۔

ہولے ہولے دوپہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سکھیا نے کاکا کی گٹھڑی میں ہاتھ ڈالا۔ اپنے ہاتھ کو پورا پھیلایا اور اس کی ہچکی کے قریب روپے نکال لئے تو سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ بہو جی

چالاک ہے سالے کا کا! سنبھال کے رکھیو اپنی گٹھری کو۔ بہت چرچیل ہو آئی ہے۔ دوسری بولی۔ اتنا کمایا ہے کا کا نے، دودھ سے اسامات پشت تک کائی ہے اور کا کا کیا دھن کو سمادھی میں لے جائے گا کا کا؟ گھر کی ماں اپنے کاکا کی بچانے کے لئے نکل آئی۔ میرا جیرام کیا کم کماتا ہے؟ تین بیس سے اوپر ایک پائی سے پیسہ ریلوائی ماں۔ دو بیویاں۔ کوئی بوجھ نہیں، باجرہ نہیں رکھ دیں، موج اڑا دیں۔

اچھا ہوا سکھیا کو بھی ان کی آمدنی کا اندازہ ہو گیا۔ تنخواہ تو اتنی بڑی نہیں تھی۔ آج کل کہاں اکٹھے روپے بنتے ہیں؟ انہوں نے چودہ جماعتیں پڑھی ہیں تو کونسی بڑی بات کی ہے۔ سکھیا کے چچیرے بھائی نے سولہ پڑھی تھیں۔ اوپر سے ہونر اور صوبے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ آخر ایک ٹھگ کمپنی میں نوکر ہو گیا۔ اس کے بعد برتن بانٹنے تھے لیکن جیرام نہ آتے۔ شاید انہیں سکھیا کی نفرت کا پتہ چل گیا تھا اور وہ اکیلے میں اپنی صورت کو کوس رہے تھے۔ دہرایا اپنی ہی غزل (غزل) گاتے بھی سکھیا نے کہا ——— جیسی کی قسمت . . . اور جیرام کو یہی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ گانا اس کے سبب چلی ہے۔ جو بھی سنتا تھا دہرایا کرے گا۔ گانے سے روکنا چاہتا تھا لیکن روکنے سے پہلے ہر مرد عورت کو اس میں اپنی ہی شکل دکھائی دیتی تھی اور وہ دہرا کو ڈانٹتے ڈانٹتے آپ اسکے رنگ میں غرق ہو جاتے۔

سکھیا نے جیرام کو تصور میں اپنے قریب آتے دیکھا۔ اس وقت سکھیا کو کمر سے نیچے سارا جسم جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پاپڑ کانوں کی لوئیں بھڑک رہی تھیں۔ یہ اگنی اتنی زبردست تھی کہ اس میں چھپکلی کے سب داغ بھسم ہو گئے تھے۔ داغ تو ایک طرف اگر چہرہ حبشی کا سا ہوتا تب بھی سکھیا کو کچھ محسوس نہ ہوتا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور بیچ آگ کے شعلے تھے۔ جن میں ایک مرد اور عورت کے مجسمے کندن کی طرح دہکنے لگے تھے۔

ان ہی خیالوں میں سکھیا جیرام کی شکل کو بھول چکی تھی۔ وہ بہت سی باتیں بھول جاتی تھی۔

اسے رہ رہ کر خیال آتا ——— وہ میرے پاس آئے کیوں نہیں؟ ذرا رونق ہو جاتی۔ اگرچہ دل نفرت سے ڈگ مگ کرنے لگتا۔ لیکن ایسی نفرت کا اور کیا علاج ہے؟ یہی ناکہ اور قریب ہو جائے آدمی۔ اور کسی کی تمام خامیاں خوبیوں میں تبدیل ہو جائیں۔

وہ نہیں آتے۔ انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ مجھے ان سے نفرت ہے؟ سکھیا سوچنے لگی۔ جونہی میں نے منہ سے ذرا گھونگھٹ اٹھا کے دیکھنے چاہے تھے تو ان ہی وہ چہرے سے اتر گئے۔ اب آنگن میں ٹہلنے والے کا منہ پھٹکار کی طرح دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ ازدواجی زندگی کا پہلا دن تھا اور وہ چیچک کے داغوں کو اتنا بھول گئی تھی۔ اتنا ——— ......

دودھ رسوئی میں تسلے پر ایک وڑیالے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگ ہی گرنے لگا۔ ہوری اچھیں کی گھگھڑیا۔ اماں نے مہریا کو آواز دی۔ کا ہو گوا تو کو؟ دودھ ابلتا و نا دکھے؟ ہے راند! پیسے مانگنے کو سر پر چڑھی چلی آوے۔ پیسہ نہ دوں گی۔ راکھ جھونک دوں گی منہ ماں! اور ملی پیلاتے ہوتے منہ کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔

ڈھور شام کے قریب پچھواڑے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ سورج بھی ڈوبا جا چکا تھا۔ پیپل کے درخت تلے تخت پوش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کملا کا داماد کی مدد سے تخت پوش پر بیٹھے ایک لال جلد والی بہی پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہے تھے۔ عینک بار بار منہ پر گرتی تھی۔ عینک کے کنارے ایک گند سفید رنگ کے ہو گئے تھے۔ کمانی کی جگہ ایک دھاگا کان تک چڑا گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے کبھی کبھی ایک آدمی کے دو دو دکھائی دینے لگتے تھے۔

گھر کی عورتوں میں ہلکی ہلکی کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ وہ کڑی نگاہوں سے جیرام کی طرف دیکھتی تھیں۔ سکھیا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کیوں نہ آتے؟ سکھیا نے چپکے چپکے آپ سے سوال کیا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے پھر بات پہلی یاد آ گیا۔ پھر جیرام! ...... سچی بڑی تیرے جیرام تو کچھ

کمرہ بھی تھیں۔ گھر کی اماں کی طرح سکھیا کو بھی جیرام کی طرفداری کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن ...... لیکن ...... سندر ہے پر اگر کالا داغ ہو تو چہرہ اور بھی زیادہ خوب صورت ہو جاتا ہے مرد کا او ہو! شریف ہو یا مست۔ سندر ہو! تعلیم یافتہ ہو تو چیچک کے داغ اس کی سندرتا بڑھا دیتے ہیں اور سکھیا اب تک ان چیچک کے داغوں میں خوبصورتی پا لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

رات ہوئی۔ سر جوڑی کیلئے جیرام کی تلاش ہوئی۔ لیکن جیرام غائب تھا۔ بڑی نند گھبرائی ہوئی آئی اور بولی۔

"سکھیا بہن، برا نہ ماننا، جوانی میں سبھی ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔"

سکھیا بولی "کیا ہٹ دھرمی ہے؟"

"یہی کہ جیا ہے نا تھوڑا وقت گزر جائے گا تو آپ ہی آپ سمجھ آجائے گی۔"

سکھیا حیرت سے نند کے منہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "کیسی بے تکی باتیں ہیں۔ میری سمجھ میں تو نا آویں۔"

"کوئی بات بھی ہو" نند بولی "جیرام کو کچھ کا چڑھاوا ہے نا۔ انہیں خیال ہے کہ سکھیا کا ناک لمبا ہے ...... اسی لئے وہ رسم پر نہیں آیا اور اب کہاں لمبا ہے ناک تمہارا؟ ...... تھوڑا وقت گزر جائے گا تو آپ ہی آپ ......"

سہاگ رات اپنے تمام دھڑکنوں کے ساتھ سر پر آ رہی تھی۔ سکھیا نے چیچک کے داغوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر کے اس میں حسن تلاش کر لیا تھا۔ لیکن جیرام اس کے ناک کو برداشت نہ کر سکتا اور رات بسر دا اور آس لیے خواب رات گزرتی گئی ...... گزرتی گئی ......

ایوالانش

جب میں کچھ پریشان سا ہوتا ہوں اور مجھے اپنا دل ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کے نیچے دبتا اور بیٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو میں اخبار بینی کرتا ہوں —— یہ میرا شغل ہے۔

اخبار میں سکون کو تلاش کرنا ایک بعید الفہم بات ہے لیکن یہ تو درست ہے کہ اس میں قتل اغوا اور اس قسم کی بیہودہ سی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں اور دوسروں کی گڑبڑیاں اور مصیبتیں پڑھ کر دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ سے کسی نے کوئی میگنی فائنگ گلاس چھین لیا ہو...... اور پھر کبھی کبھی خبروں میں ایسے قابلِ ملامت ہوتے ہیں، عجیب عجیب خبروں پر مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ان خبروں:-

"سنگوریٹی کلا ٹریلا (دکن) ۱۵ دسمبر... کوئلے کی کان میں سخت دھماکہ ہونے سے ایک شخص مسمی گوردنا تھ ڈنگشٹارتیہ کی موت واقع ہو گئی۔ متوفی......"

گرمن

اس وقت میرے پاؤں میں سے میرا دم جا سکتے ہیں۔ میں بھول جاتا ہوں کہ میں ایک بہتر
آدمی ہوں۔ چاہئے ہو کہ میں نے ابھی ابھی پی ہے اس کے چند قطرے میری داڑھی میں آ لگے ہوئے
ہیں۔ گوروناتھ دینکٹارمیہ ..... خدا کی قسم، کیا عجیب نام ہے ہاہاہا!! ..... شیلا ..... رتو .....
شیلا، رتو اور میری بیوی جمنا تینوں بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔ کیسا عجیب نام ہے، تم نے
دیکھو؟ ..... تم نے دیکھا ..... گوروناتھ وین ..... کٹا ..... رمیّہ .....
ہاہاہا! اور ہم سب بھول جاتے ہیں کہ اس بیچارے کی موت حادثہ سے واقع ہوئی۔ ایک
نہایت افسوسناک حادثہ سے۔ اور متوفی کی شادی ہوئے ابھی صرف تین ماہ ہی گزرے تھے۔
جمنا، میری حساس بیوی سوچتی ہے کس طرح بیچاری کی سرخ چوڑیاں توڑ دی گئی ہوں گی۔ بھول گئی
نہیں جانتی دکن میں عورتیں سرخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ اگر وہ سوچے کس طرح بیچاری کی مانگ کا
سیندور پونچھ دیا گیا ہوگا تو شاید کچھ بات بھی ہے۔ جمنا آنچل سے اپنی نمناک آنکھوں کو صاف
کرتی ہے۔ شیلا اور رتو کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتی ہیں لیکن وہ تینوں پاگل ہیں۔ ہمیں
گوروناتھ کی موت سے مطلب؟ ایک سانس کے ساتھ دنیا میں سینکڑوں انسان مر جاتے ہیں۔
اور پھر ان سے کہیں زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کا دوسرے انسان
کے ساتھ کوئی رشتہ ہے ..... لیکن میرا دل دبا ہوا ہے اور ..... اخبار میرا آنچل ہے ——

> نندہ دیوی کے قریب ایک چوٹی کو سر کرنے کے لئے بین الاقوامی افراد پر مشتمل ایک
> پارٹی آ رہی ہے۔ چونکہ آج کل سردی ہے پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہوگی۔ اس لئے
> پارٹی کے تمام افراد عنقریب ہی چڑھائی شروع کر دیں گے ان افراد میں دو روسی ہیں،
> ایک افغانی اور ایک جرمن عورت ہے۔ نام الیکسی نکولائی کوراٹیکن، ساتو
> رنکو لو ہیتگنی اور جرمن عورت کا نام فراؤ کرپ ..... ہاہاہی ..... ہی!!

گردش

«ضلع جہلم میں ایک معزز و مرتبہ خاندان کے ہاں برات آئی۔ لڑکی والوں نے جہیز میں پچیس تولے سونا، ایک ہزار روپیہ نقد، فرنیچر، بھینسیں اور بہت کچھ مال و دولت دی۔ پھیرے کے بعد لڑکے نے اپنے سسرال سے کار مانگی .....»

پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد میرا دل کانپنے لگتا ہے۔ ٹانگیں ڈگمگانے لگتی ہیں۔ آنکھوں پر سے عینک گر پڑتی ہے۔ اخبار چھوٹ جاتا ہے۔ میں اسی طرح سہمے سہمے آوازیں دیتا ہوں۔ شیلا، رقو، چنا ـــــ ادھر آنا ..... کوئی نہیں آتا۔ یہ لوگ میری دیوانی عادتوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ گویا وہ مجھے میرے اخبار کے آخری کالم اور میری زندگی کے آخری سانس تک اکیلا چھوڑ دیں گے، تن تنہا، بے یار و مددگار، دیوانہ ..... کیا کوئی کسی کا ہے؟ .... بیوی اور بچے ..... رقو آ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں اسی طرح نمناک ہوتی ہیں۔ وہ اخبار کو پڑھتی ہے، اور پھر آہستہ سے میرے کندھے کو چھوتے ہوئے کہتی ہے :۔

«پتاجی ..... آپ نے آگے بھی پڑھا؟»

«نہیں تو، بیٹی»

«پڑھیئے .... یہاں سے ـــ انکار کر دیا اور آگے .... ہاں ہاں یہ یہ»

اور رقو کی چھنگلی سطر کے ساتھ ساتھ دوڑتی جاتی تھی۔ سطر کے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں اعراب ناچنے لگتے ہیں، ضرورت سے زیادہ جیسے ہو جاتے ہیں۔

«لڑکے نے اپنے سسرال سے کار مانگی۔ لڑکی والوں نے اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے انکار کر دیا اور ڈولی روک لی۔ برات کو ناکام واپس لوٹنا پڑا اور ندامت سے اپنے تئیں بچانے کے لئے دولہا والوں کو فوراً ہی ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں ایک الھڑ، جاہل، دیہاتی لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔»

گومتی

——— اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا راجہ ہے ——— بہت بڑا فرعون، استبدادی ایسا کہ انھوں کسی کی بھی عزت محفوظ نہیں۔ اس کی رعایا نے اس کے جور و استبداد سے تنگ آ کر ہتھیار اٹھا لیے ہیں ——— لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں، ہتھوڑے ... بہت ہی اچھا کیا، میں کہتا ہوں، لڑکی والوں نے بہت ہی اچھا کیا!

میرے مکان کی گھنٹی بجی۔ میں جانتا تھا صاحب رام آتے ہی ہوں گے۔ کپور اڈھائی گز اونچی، بڑی اونچی ذات ہے۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے جھروکے سے جھانک لیا۔ نہ لنی ——— وہی مجھے ——— کپور، امرتسری طرز کی سیدھی سی کشتی نما گڈی بندھی ہوئی تھی۔ کالا بند گلے کا کوٹ اور ابھی پاجامہ، شانے پر شال رکھی تھی۔

میں نے جمنا کو بٹھا دیا اور پوچھا۔

”گلدستے تبدیل کیے ہیں جمنا؟“

”گلدستے؟ ہاں تو کیے ہیں ... نہیں کیے، صرف ان کے خلاف ....“

”پھولدان؟“

اس دفعہ رقّو آگے آئی۔ وہ جانتی ہے نا کہ میں اکثر اس سے خواہ مخواہ کہتا رہتا ہوں، کسی بھی بات کا غصہ اس پر نکالتا ہوں ..... شاید یہ بھی کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں، اور اس سے بہت کچھ متوقع ہوں۔

وہ بولی ” رکھ دیے ہیں پھولدان ..... اور اپنے کارڈ بھی ہو سکے میز پوش بچھا دیے ہیں۔“

اس وقت نہ جانے مجھے اپنی بیٹی میں کیا دکھائی دیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

گرہن

ایک دیوانے نے آشیرواد کے ہاتھ رقّو کے سر پر چلا گئے۔ رقّو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گویا آنکھوں کے راستے سے وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی ہے۔ اری بھولی لڑکی! کیا یہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے کا وقت ہے؟ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو تم تینوں میں سے میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ کوئی بھی میرے جذبات کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ میری پرواز کے ساتھ نہیں اڑتا ۔ ۔ ۔ ۔ تم سب مجھے سنکی سمجھتے ہو اور یہی تمہاری بھول ہے ۔ ۔ ۔ باہر کبوتر کھڑے ہیں، بادبانوں میں سودے ہو رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے رقّو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تم سب اپنے کمرے میں چلے جاؤ ۔ ۔ ۔ جاؤ ۔ ۔ ۔"

صاحب رام آئے۔ جسم کے بجلی بھر کم تھے۔ نتھنے ضرورت سے زیادہ فراخ تھے۔ بھویں زیادہ گھنی تھیں اور کانوں پر لمبے لمبے سخت سے بال اُگ کر پگڑی سے باہر دکھائی دے رہے تھے۔ ماتھا اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ جس پر بالکل کال روپ تھے۔ بار بار شال کو سنبھالتے تھے گویا اس کا مظاہرہ کرنا کوئی بہت ضروری بات تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر رقّو کے ہاتھ کے کرشمے ہوئے 'سواگتم' (خوش آمدید) وغیرہ کو دیکھتے رہے۔ پھر تصویروں پر نظر دوڑائی اور نہایت احتیاط سے کرسی کو میرے قریب سرکاتے ہوئے بولے :-

"سب سے پہلے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں!"

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے کہا "معافی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا غلام ہوں۔ دیکھیے نا، دست بستہ غلام! آپ ہمارے صاحب ہیں۔ یہ رشتہ ہی کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

صاحب رام مسکرائے، جیسے کہ مسکراتے ہیں، اور بولے "میں نے سنا ہے۔ آپ کی رقّو کی دو مرتبہ منگنی ہوئی تھی!"

اس وقت میں نے دروازے کے پیچھے حجابی انگلی ہلتی ہوئی دیکھی۔ وہ مجھے اشارات میں جواب

دینے سے منع کر رہی تھی۔ پھر اس کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے تھیٹر میں ایک پرامپٹر ہوتا ہے۔ لیکن پرامپٹر کا ہنر اسی بات میں ہے کہ حاضرین کو ان کے وجود کا پتہ نہ چلے اور صاحب رام سن نہ پہچان سکے۔ میں حقیقت سے اتنی جلدی انکار نہ کر سکا۔

میں نے کہا "جی ہاں"

صاحب رام بڑے ہمدردانہ انداز سے بولے "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ منگنی ٹوٹ کیوں گئی؟"

اس وقت میرے منہ میں لعاب خشک ہو گیا ـــــ رتو نے گلدان اچھی طرح رکھے اور پھول سلیقہ سے سجا رکھے تھے۔ ... میں نے اپنی داڑھی کو کھجاتے ہوئے بتایا ـــــ

"وہ اس وجہ سے چھوٹ گئی کہ میں ایک غریب وائس لائن انسپکٹر ہوں۔ رتو کو میں نے پڑھایا ہے لکھایا ہے، اچھی تعلیم دی ہے۔ آپ ایک غریب وائس لائن انسپکٹر سے کیا متوقع ہو سکتے ہیں کیا وہ اپنی بیٹی کو تعلیم کے لئے آکسفورڈ بھیج دے گا؟ معاف کیجئے ... باقی رہی دینے دلانے کی بات، میں نے رتو کو استطاعت سے زیادہ دینے کے لئے خاکروبوں، جمعداروں سب ماتحتوں کے منہ سے نوالے چھینے ہیں۔

غنی محلہ میں نالیاں بنانے کا ٹھیکہ جناب بلمر کو دلوا کر اس سے ایک کافی بڑی رقم اینٹھی ہے اور اب اس کا پتہ چل چکا ہے۔ میرے بیان ہو چکے ہیں۔ میری نوکری، میری میرے بچوں کی، میرے دو یتیم بھتیجوں کی زندگی خطرے میں ہے اور چونکہ میں جہیز میں زیادہ دینے کے اہل نہیں تھا ... وہ رشتے ٹوٹ گئے، ٹوٹ گئے، سنا آپ نے؟"

صاحب رام نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ان سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی نگاہوں میں ایک رعشہ پیدا کر دینے والے معانی نظر آئے۔ گویا وہ میری رتو کو مشکوک چال چلن سمجھتا ہو ... رتو ... میری بیٹی رتو۔ کیا ایسی بھی ہو سکتی ہے؟ ... میرے

ہاتھ میں ریوالور ہو تو میں صاحب رام کا دماغ پاش پاش کر دوں۔

صاحب بڑے بڑے سردار صاحب دیکھے۔ میں کل بینک میں لڑکے سے لڑا تھا وہ اس بات پر بضد ہے کہ ایک ہزار روپیہ ہر ایک ہی رکھا جائے۔ فرنیچر سب کا سب ساگوانی ہے، ریڈیو اور اگر ایک ریفریجریٹر۔ ۔ ۔ ۔ ؟

باقی کا میں نے نہیں سنا۔ صرف آخری الفاظ صاحب رام کے چلے جانے کے بہت عرصہ بعد تک میرے کانوں میں گونجتے رہے — "ابھی بابو زرگار لڑکے آج کل ملتے کہاں ہیں؟"۔ ۔ ۔ مجھے یاد آیا، میری نوکری، میری زندگی —— چھ زندگیاں خطرے میں ہیں اور شاید ایک دفعہ ایک راجہ کے جور و استبداد سے تنگ آ کر رعایا نے بغاوت کی تھی اور محل کے نیچے لاٹھیاں، گنڈاسے اور درانتیاں، ہتھوڑے۔ ۔ ۔ ۔ اچھا کیا۔ ۔ ۔ ۔ اچھا کیا!!

برسات کے دنوں میں دیودار کی لکڑی کے مسام پھیل جاتے ہیں اور دروازے دہلیز کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ میں نے زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازے کے پیچھے رقو اسے پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دروازہ پٹ سے کھلا اور رقو کی پیشانی کے ساتھ ٹکرایا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں رقو کی خوب لاتوں، گھونسوں سے مرمت کروں، خوب ماروں اُسے۔

لیکن ایک اور ہی جذبہ میرے دل میں عود کر آیا۔ انسان اپنے دل اور کردار کے متعلق خود نہیں جانتا کہ فلاں وقت میں کونسا جذبہ، کونسا عمل سب سے اوپر جگہ پائے گا۔ میں نے رقو کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا "رقا میری بچی۔ ۔ ۔ زیادہ تو نہیں آئی —— چوٹ؟"

میں نے دیکھا رقو کو چوٹ کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ یا وہ

گنی اور ہی چوپٹ کو سہلا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بدستور فرش پر گاڑھے ہوئے پوچھا "وہ کیا کہتے تھے؟" اور پھر وہ کچھ شرما سی گئی۔

———— ایک پر امپٹر کے بغیر میں نے سب کچھ چھپا لیا۔ میں نے کہا میں رقو کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ کوئی تعجب نہیں کہ رقو خود ہی دروازے کے پیچھے سنتی رہی ہو۔ لیکن میں رقو کو کیوں بتاؤں؟ اسی کی وہی چنچل ایک دن پہ دوان کی ایک خبر پہ دوڑ رہی تھی۔ اس خبر میں لکھا تھا ...... اپنے باپ کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے نیک لڑکی نے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا لی۔ میں نے رقو کو بالکل بچہ سمجھتے ہوئے گود میں اٹھا لیا۔ پہلے تو وہ شرمادی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔

میں نے کہا "وہ کہتے تھے لڑکی تو بہت خوش دکھائی دیتی ہے۔ . . . پوچھتے تھے یہ پھول امی نے کاڑھے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ کہنے لگے کیا خوب میں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ پھر بولے۔ رقو بہت اچھے اخلاق اور اطوار کی سنی جاتی ہے . . . .
میں نے کہا . . . . ہاں . . . .

اور اس سے زیادہ میں نے کچھ نہ کہا۔ میں کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ جانے مجھے کس نے زور سے گلے سے پکڑ لیا ہو ——— کچھ دیر بعد اپنے اہل کو جھلسنے کے لئے میں نے رقو کو دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ . . . . رقو جاؤ . . . . جب میں اکیلا ہوتا ہوں۔ تو تم میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں آتا۔ کوئی بھی میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔ کوئی بھی میری پرواز کے ساتھ . . . . کیا میں سنکی ہوں، بے وقوف . . . . اور جب میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ تو تم سب میرے پاس آ جاؤ گے۔

جاؤ، مجھے اپنے اخبار کا آخری کالم اطمینان سے پڑھنے دو۔ ۔ ۔ ۔ ہاں! جمنا سے کہہ دینا ایک انگیٹھی میں بہت سے کوئلے ڈال کر بھیج دے۔ حرامزادی کو میری ذرا پروا نہیں۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ آج مجھے بہت سردی لگ رہی ہے ...... ہو ہو ہو ...... مرا جاتا ہوں مارے سردی کے ......"

رنو میری عادت سے واقف تھی۔ چپ چاپ چلی گئی۔ آپ ہی انگیٹھی لے آئی۔ میں نے اخبار کو اٹھایا۔ وہ بین الاقوامی افراد پر مشتمل پارٹی کنچن جنگا یا نندا دیوی کے قریب کسی چوٹی کی بلندیوں کو سر کر رہی تھی۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ یکا یک برف کا ایک تودہ پھسلا۔ ایک بڑی سی ایوالانش نے انہیں آ لیا۔ پارٹی کے سب ممبر، چند قلی مزدور، خچر، سب دب گئے۔ شاید مر بھی گئے ہوں گے۔

—— جب ایوالانش آتی ہے۔ تو بڑے بڑے درخت، چھوٹے چھوٹے پودے، ہر نخل و ثمر کو بہائے جاتی ہے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ ہو جاتے ہیں، انسان، مویشی، پرند مر جاتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں —— قحط سالی ہوتی ہے ...

اس وقت ان افراد کے نام پڑھ کر میں نے ہنسنے کی کوشش کی —— الیکسی نکولائی کوراٹیلس، سائنور نکولو ہیگینی، اور جرمن عورت فراو گریپ، لی ژن شانگ ... لیکن مجھے ہنسی نہ آئی۔

اس کے دو تین دن بعد بہت سردی پڑی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا —— رشوت لینے کی وجہ سے ...... رنو شادی کی انگشتری کو بڑی طنزیہ نگاہ سے دیکھنے لگی۔ مجھے تو اس کی عادتوں میں بے اعتدالی

دکھائی دینے لگی۔ مجھے تو اس کے چلن پر بھی شبہ ہونے لگا۔ . . جمنا میری دو
بیٹیوں، تین بھتیجوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ . . . . . اسی دن رقو دوڑی دوڑی
آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ بولی "کیا آپ نے آج کا اخبار دیکھا
ہے؟" میں نے کہا، "نہیں"۔ . . . . . اس نے ایک کالم میری آنکھوں کے سامنے
رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ ایک "ہوائی کموڈور" کے تحت میں ایک ریسکیو پارٹی نے ایوالانش
کی زد میں آئے ہوئے سب آدمیوں کو بچا لیا۔ میں نے تسکین کا ایک گہرا سانس لیتے
ہوئے اس بلا کی سخت سردی میں اپنے یخ بستہ ہاتھوں کو سینک سینک کر دل پر
رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کوئی ریسکیو پارٹی آئے گی؟ . . . . رقو! . . . کیا
وہ ہمیشہ آتی ہے؟"

[illegible]